بملاحظہ گرامی مولانا ابوالکلام آزاد
از سید عبداللطیف
25/12/19

وہ ذہن جسکی تعمیر قرآن کرتا ہے

مُصَنّفَہ

ڈاکٹر سیّد عبداللّطیف پی ایچ، ڈی (لندن)

سابق پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

مُترجمَہ

عبدالقیّوم خاں باقی ایم، اے

ریڈر شعبۂ اُردو و فارسی نظام کالج، حیدرآباد دکن

اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز

حیدرآباد دکن

فہرستِ ابواب

	صفحہ
۱۔ سخن ہائے گفتنی — از ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں ایم اے (عثمانیہ) ڈی فل (لیپزگ)، ڈپ یل یس سی (لندن) یف یل اے کیوریٹر، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) حیدرآباد دکن	۱
۲۔ دیباچہ	۱
۳۔ باب اول۔ قرآن قرونِ وسطیٰ کے شکنجہ میں	۹
۴۔ باب دوم۔ لنگرگاہ	۲۰
۵۔ باب سوم۔ تیاری	۴۲
۶۔ باب چہارم۔ مشیّتِ الٰہی	۶۱
۷۔ باب پنجم۔ عمل صالح	۹۰
۸۔ باب ششم۔ حیاتِ مابعد	۱۰۵
۹۔ باب ہفتم۔ امتاً وسطاً	۱۳۵
۱۰۔ باب ہشتم۔ پس چہ باید کرد	۱۵۲
۱۱۔ حوالہ جات	۱۹۹
۱۲۔ اشاریہ	۲۰۴

سخن ہائے گفتنی

ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب کی گراں قدر انگریزی تصنیف "The Mind Al-Quran Builds" جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اسلامی ادبیات عالیہ میں ایک بلند مقام حاصل کرلیا ہے، تقریباً تین سال قبل حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ انگریزی داں طبقوں میں اس کتاب کا نہایت ہی پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ مضمون کے اعتبار سے یہ کتاب دورِ حاضر میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی اور سب سے عمدہ کتاب قرار دی گئی۔ اردو داں طبقہ اس کا متمنی تھا کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی جلد از جلد شائع کروا دیا جائے تاکہ انہیں بھی اس سے استفادہ کا موقع مل سکے۔ ابتداءً چند کہنہ مشق مترجمین نے اس کتاب کے ترجمہ کی کوشش بھی کی لیکن ڈاکٹر صاحب کی قادر الکلامی اور ان کے مخصوص اسلوب بیان کے سامنے انہیں اپنی ہار ماننی پڑی اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کا انداز تحریر سادہ اور واضح ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا چست، جامع اور بلیغ ہوتا ہے کہ اس کو کسی دوسری زبان میں اسی انداز و روانی کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمہ کرنے کے لئے بڑی دماغ سوزی اور جگر کاوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ میں ڈاکٹر صاحب کی اس انگریزی تصنیف کے دوران میں ان کے ساتھ اور ان کی تحقیقات میں شریک رہا ہوں اور

یہ وہ ابتدائی مسودہ تھا جو انہوں نے بدوران گرمائی تعطیلات اورنگ آباد میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہ کے ایک پرسکون گوشہ میں بیٹھ کر مکمل کیا تھا اور یہ ترجمہ درحقیقت ان کی اس اندرونی خواہش کی تکمیل تھی جو اُن میں ڈاکٹر صاحب کی انگریزی تصنیف کے مطالعہ کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس اچانک واقعہ نے ڈاکٹر صاحب کے موقف کو نہایت پیچیدہ کر دیا مجھے بھی اس کی اطلاع کروائی گئی۔ گو مجھے اس واقعہ سے تکلیف ضرور ہوئی لیکن یہ دیکھ کر کہ ڈاکٹر صاحب کے ایک قدیم شاگرد ہی نے اس ترجمہ کو تقریباً مکمل حالت میں پیش کیا ہے، میں نے ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی کہ باقی مرحوم کی اس پیشکش کو قبول فرمالیا جائے لیکن میری یہ خواہش ہے کہ میرا کیا ہوا ترجمہ ضرور شریکِ کتاب رہے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ دیباچہ اور پہلے باب کا میرا ترجمہ بجنسہٖ شریکِ کتاب کرلیا جائے اور دوسرے باب سے آخر تک باقی مرحوم کا ترجمہ رہے۔ چونکہ باقی مرحوم کے ترجمہ میں بعض مقامات تشنہ رہگئے تھے اس لئے یہ بھی طے پایا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں اپنے مسودہ کی اصل متن کیساتھ مقابلہ کرتے ہوئے نظرثانی کرینگے تاکہ مسودہ میں کوئی خامی رہنے نہ پائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مشیت کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ اس تصفیہ کے چند ہی ہفتوں بعد یکایک موت کے زبردست چنگل نے باقی مرحوم کو ہم سے چھین لیا۔ اس ناگہانی حادثہ کا ڈاکٹر صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ باقی مرحوم کا یہ مسودہ ایک مدت تک ایسا ہی دھرا رہا اس لئے کہ جب کبھی آپ اسکی نظرثانی کا

اس سلسلہ میں مجھے تھوڑی بہت حقیر خدمات بھی انجام دینے کا موقع ملا ہے اس لئے طبعاً ڈاکٹر صاحب کا یہ رجحان تھا کہ میں ہی اس کتاب کا اردو ترجمہ کروں تاکہ اردو زبان میں ان کے افکار و خیالات کی صحیح صحیح ترجمانی ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ ناچیز کی حقیر خدمات کا جس شفقت آمیز انداز میں اپنے دیباچہ میں تذکرہ فرما کر مجھے جو اعزاز بخشا ہے اس کے لئے میں اپنے محترم استاد کا بیحد ممنون و شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس رجحان کو محسوس کرتے ہوئے میں نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے، اس کتاب کے اردو ترجمہ کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں جس پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی مسرت اور اطمینان کا اظہار فرمایا۔ کتاب کا ترجمہ شروع کر دیا گیا اور اکثروں کو یہ معلوم بھی ہو گیا تھا کہ میں اس کام میں مصروف ہوں لیکن کسے کیا خبر تھی کہ اس کتاب کے ترجمہ کا شرف درحقیقت کسی اور کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے۔ مصروفیات کی وجہ ترجمہ کی رفتار کسی قدر سست تھی۔ دیباچہ اور پہلے باب کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ دوسرے باب کا آغاز تھا کہ ایک واقعہ رونما ہوتا ہے۔ میرے ایک مرحوم دوست عبدالقیوم خاں باقی جو نظام کالج کے شعبہ اردو و فارسی میں ریڈری کی خدمت پر فائز تھے، ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوتے ہیں اور کاغذات کا ایک پلندہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں تحفۃً پیش فرماتے ہیں۔ یہ پلندہ دراصل ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے پہلے سات ابواب کا اردو ترجمہ تھا جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے علم و اطلاع کے بغیر کیا تھا۔ مرحوم کے بیان کے مطابق گویا

آپ نے اپنی تصانیف اور تحریرات کے ذریعہ اپنی سنجیدہ فکر رسا اور اپنی ماہرانہ قابلیت کا سکہ بٹھایا اور اپنے زور قلم کا لوہا منوایا ہے۔ دنیا نے آپ کو ایک بہترین ادیب، ایک پختہ کار سیاس اور ایک اعلیٰ مفکر کی حیثیت ہی سے جانا لیکن بہت سارے ابھی اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک اور شخصیت بھی ہے جس کا تعلق ان فقرائے عالیہ کے سلسلہ سے ہے جن کا منصب رشد و ہدایت اور مذہبی پیشوائی رہا ہے۔ میں یہاں ڈاکٹر صاحب کی اسی شخصیت کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ وہ جوہر جو بطور ورثہ آپ میں ودیعت کیا گیا تھا وہ اب کس طرح تاباں و درخشاں ہوکر اپنی ضیاء پاشی کرنے لگا ہے۔ بلحاظ حسب و نسب ڈاکٹر صاحب حسنی اور حسینی سادات سے ہیں۔ ددیال کی جانب سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت جلال الدین مخدوم جہانیان جہاں گشت رح سے اور ننیال کی جانب سے راست حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح سے ملتا ہے۔ اس سلسلہ کے بزرگوار حضرات نے دین اور مذہب کی جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ان بزرگوں کے علمی کارنامے آج تک سرچشمۂ علم و نور بنے ہوئے ہیں اور ان کے روحانی فیض سے ایک دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ آپ کے جد اعلیٰ حضرت شاہ عبداللطیف رح المعروف بہ یاہو بادشاہ ایک باکمال بزرگ گزرے ہیں جن کے روحانی فیض کا سلسلہ آج تک کرنول میں جہاں آپ آرام فرما ہیں، جاری و ساری ہے۔ ڈاکٹر صاحب انہی فقرائے عالیہ کے سلسلہ سے منسلک اور

خیال فرماتے شاگرد مرحوم کی یاد آپ کیلئے بیچینی اور تکلیف کا باعث ہو جاتی۔ غرض کچھ دنوں بعد اس مسودہ کی تکمیل کر لی گئی اور بیضہ نظر ثانی کے بعد بغرض طباعت پریس کے حوالے کر دیا گیا۔ اب اسی اُردو ترجمہ کو بعنوان "وہ ذہن جسکی تفسیر قرآن کرتا ہے" زیور طبع سے آراستہ کر کے ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے تا کہ اُردو داں طبقہ اس سے کما حقہٗ استفادہ کر سکے۔ افسوس کہ باقی مرحوم اس وقت ہم میں موجود نہیں۔ اگر وہ ہوتے تو وہ خود اس کتاب کا پیش لفظ لکھتے لیکن چونکہ وہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں اس لئے مجبوراً مجھے ان کا یہ فرض ادا کرنا پڑ رہا ہے۔

میں اپنے ان چند تمہیدی سطور کو بجائے "پیش لفظ" کے "سخن ہائے گفتنی" سے معنون کر رہا ہوں اس لئے کہ مجھے تو یہاں درحقیقت "منظور ہے گزارش احوال واقعی"۔ رہا پیش لفظ تو سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر لطیف جیسے صاحب فکر اور صاحب قلم کی کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنا نہ تو میرے بس کی بات ہے اور نہ بساط کی۔ لیکن جب مجھے سخن ہائے گفتنی سے سابقہ پڑ ہی چکا ہے تو میں یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس موقع پر اس کتاب اور اس کے قابل مصنف کے متعلق ان حقائق کو بھی آشکار کر دوں جو اس گراں قدر تصنیف کا حقیقی پس منظر رہے ہیں۔

ڈاکٹر لطیف کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ آپ کو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ علم و ادب اور سیاست کے میدانوں میں

چنگاریاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور بالآخر یہ چنگاریاں ایک شعلہ کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ ایک نیا ڈاکٹر لطیف جنم لینے لگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب قرآن و حدیث اور اسلامیات کا بنظر غائر مطالعہ فرمانے لگتے ہیں۔ بیجا نہ ہوگا اگر میں یہاں اپنے مشاہدات کو مختصراً یوں بیان کردوں کہ اس دوران میں بسا اوقات میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک عجیب استغراقی کیفیت میں دیکھا اور بحالتِ رقت میں نے آپ کو بارہا ھو اور یاھو کے نعرے لگاتا ہوا پایا۔ آگ اپنا کام کرچکی تھی، مشیت کا منشاء پورا ہوچکا تھا۔ آپ کی فکر رسا کام کرنے لگتی ہے اور اپنے لئے ایک نرالے موضوع کا انتخاب کرتی ہے۔ قلم کو جنبش ہوتی ہے اور آپ کا سوزِ دروں اپنے مخصوص انداز میں اسلام کی حقیقی روح اور قرآنی تعلیمات کا لبِ لباب اپنے اندر لئے ہوئے ایک کتاب "The Mind Al-Quran Build" کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے دل کی پکار ہے اور آپ کا بہترین شاہکار۔ عہدِ حاضر میں اعلائے کلمۃ الحق کی یہ ایک نہایت ہی ممتاز اور جرأت آمیز کوشش ہے اور وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی یہ گراں قدر تصنیف صحیح معنوں میں احیائے افکار اسلامی کا سنگِ بنیاد رکھتی ہے۔

میں اُوپر عرض کرچکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی اس انگریزی تصنیف کو شائع ہوئے تقریباً تین سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت کیساتھ ہی انگریزی داں دنیا نے جس میں مشرق و مغرب کے ارباب علم و ارباب صحافت

یا ہو بادشاہؒ کے سجادہ اور گدی نشین ہیں۔ اس نسبی تعلق اور اسلاف کے علمی کارناموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا کہ اسی گھر کا چشم و چراغ اسلام و مذہب کی خدمت سے مستثنیٰ رہے۔ مشیت کا یہ منشاء تھا کہ آپ اسلام کی ایک اہم خدمت انجام دیں اور اپنے پیچھے ایک ایسی یادگار چھوڑ جائیں جو بنی نوع انسان کی راہِ راست کی طرف رہبری کرتی رہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی مذہب سے بیگانہ اور ناآشنا نہیں رہے ہیں۔ جیسے جیسے آپ کے علمی تبحر میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے ہی آپ کے اسلامی شغف میں زیادتی ہوتی گئی۔ اسلامی ثقافت اور اسلامی معاشرہ پر اعتراض کرنے والوں کو آپ نے اپنی بے باک و بیدار تحریرات سے ایسا مدلل و مسکت جواب دیا کہ پھر اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو سکی۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں آپ کے قلم کو کبھی کھڑی سنانے میں کبھی لغزش نہیں ہوئی اور ببانگ دہل آپ نے اپنی سنجیدہ آرا کا اظہار فرمایا۔ آپ کے اس اسلامی شغف میں اندرونی طور پر بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عہدِ حاضر کے انقلابات، مسلمانوں کی زبوں حالی اور حقیقتِ مذہب سے بیگانگی، ملتِ اسلامیہ کا انتشار، اسلام اور بانیٔ اسلام پر معترضین کے رکیک حملوں اور اغیار کی مسلمانوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوششوں نے آپ پر تازیانہ کا کام کیا۔ خفتہ جذبات بیدار ہونے لگے۔ اسلام اور بانیٔ اسلام سے آپ کو جو والہانہ محبت تھی وہ آشکار ہونے لگی۔ وہ آگ جو ایک عرصہ سے دبی ہوئی تھی آہستہ آہستہ سلگنے لگتی ہے۔ دفعتاً اس میں

میری آئندہ تصنیف کیلئے نہایت قیمتی اور قابل قدر اشارات فراہم کئے ہیں۔"

امریکہ کے حکومتی محکمہ تحقیق فراست نفسیہ کے صدر ڈاکٹر ای، ایم کرک پیٹرک جن کا اہم فرض دنیا کے نفسیاتی رجحانات پر کڑی نگرانی رکھنا ہے، اپنے مکتوب میں اعتراف کرتے ہیں:۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب گویا مشرق و مغرب کی کشمکش میں قرآن کو نمایاں اہمیت دینے کی ایک نہایت ہی دلچسپ کوشش ہے۔ آپ نے اپنے دعویٰ کی اساس کو نہایت ہی قوی اور معقول انداز میں پیش فرمایا ہے۔"

پنڈت سندر لال دہلی سے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "آپنے نہایت سچائی اور قابلیت اور محنت کیساتھ قرآن کا ایک ایسا انٹرپریٹیشن پیش کیا ہے جو سچ بھی ہے اور جس کی اس وقت ضرورت بھی ہے اور جو بہتوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب کو بہت سے لوگ پڑھیں، ہر مذہب کے لوگ پڑھیں اور خاص کر اس ملک کے زیادہ سے زیادہ وہ لوگ پڑھیں جو اپنے کو مسلمان نہیں سمجھتے۔"

پونہ کے مشہور و معروف سادھو ٹی، ایل، وسوانی جو اپنے علم و فضل اور مرتبہ کے اعتبار سے خاص وقعت کے حامل ہیں اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "آپ کی کتاب شروع سے آخر تک دلآویز ہے۔ میں خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ ہندوستان اور انسانیت کی خدمت کیلئے اپنا فضل زیادہ سے زیادہ

شامل ہیں اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے احساسات و تاثرات کا اظہار فرمایا۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان میں سے چند ممتاز شخصیتوں کے آراء و تاثرات کے نمونوں کو یہاں پیش کردوں تاکہ ناظرین کو اس کتاب کی صحیح قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

امریکہ کی مشہور یونیورسٹی اگل تھارپ کے چانسلر ڈاکٹر فلپ ولٹنر جو مسیحی دنیا میں اپنے علم و فضل کے اعتبار سے نہایت ہی احترام اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، اپنے ایک مکتوب میں مصنف کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کی کتاب میں ایک بھی بات ایسی نہیں جس سے مجھ جیسا کوئی بھی آدمی باوجود اس کے کہ اس نے مسیحی عقائد و روایات کی روشنی میں نشو و نما پائی ہو پورا پورا اتفاق نہ کرے۔"

جرمنی کا مشہور مستشرق پروفیسر گلاسیناپ (ٹیوبنگن یونیورسٹی) اس کتاب کو اسلام کے تمام اہم اور عالمگیر حیثیت رکھنے والے امور کی قابل قدر نمایندگی کرنے والی کتاب قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:۔ "میں نے آپ کی دلآویز کتاب محویت انگیز دلچسپی کیساتھ پڑھی۔ آپ کے تبحر علمی، آپ کی وسیع المشربی اور آپ کے سادہ اور دلکش اسلوب بیان نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مایہ ناز تصنیف سے اپنی کتاب "پانچ بڑے مذاہب" کی اشاعت تک لاعلم و بے خبر رہا۔ آپ کے دین کے ان تمام امور کے متعلق جو اہم ہیں اور عالمگیر حیثیت رکھتے ہیں، آپ کی ممتاز نمائندگی نے

اپنے صحیح تناظر اور اصلی رنگ میں سمجھ سکیں۔ اللہ جل شانہ آپ کو اسلام اور انسانیت کی خدمت کیلئے صحت و عافیت کیساتھ بدیر سلامت رکھے۔"

اسلامک ریویو لندن اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے:۔

"اس بیش بہا کتاب کے مصنف دنیائے ادب اور دنیائے اسلام میں اچھی طرح متعارف ہیں۔ موجودہ تصنیف موصوف کا بہترین شاہکار ہے۔ مصنف اپنی اس روح پرور کتاب کے لئے ہر طرح قابلِ مبارکباد ہیں۔ مسلمانوں کے ہر گھر اور ہر کتب خانہ میں یہ کتاب ضرور موجود رہنی چاہیئے۔"

جمعیۃ العلماء کا اخبار "مسیح" جو دہلی سے شائع ہوتا ہے، رقمطراز ہے:۔ "کوئی بھی ریویو یا تبصرہ نہ تو اس کتاب کی صحیح قدردانی کرسکتا ہے اور نہ اس کو حقیقی داد دے سکتا ہے۔ ہماری رائے میں اسلام کیساتھ گزشتہ ایک ہزار سالہ ناانصافی و غلط نمائندگی کے بعد یہ کتاب درحقیقت اسلام کو اس کے اپنے اصلی رنگ و روپ میں پیش کرنے والی سب سے پہلی صحیح اور ممتاز کوشش ہے۔"

"اسلامک لٹریچر" لاہور لکھتا ہے:۔ "موجودہ کتاب میں ڈاکٹر لطیف کا مقصد صرف علمی نہیں بلکہ عملی ہے جیسا کہ وہ اپنے مطالعہ اور تحقیق کے ذریعہ جدید سائنٹفک خیال اور قرآن کی اثر آفریں تعلیمات کی روشنی میں ہماری اپنی ثقافتی زندگی اور ہمارے اپنے نظام مدنی کی تعمیر و تشکیل جدید کیلئے منصفانہ تجاویز پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے دعویٰ کو محکم دلائل سے ثابت

آپکے شامل حال رکھے۔ روحانی خزانوں سے آپکا دل و دماغ مالا مال ہے۔ خدا کرے کہ آپ ہمیں اور زیادہ سے زیادہ ان پوشیدہ خزانوں سے مستفید فرمائیں جبکہ آج منفرد اشخاص اور اقوام ہر دو اُس حکمت و دانائی کے بھوکے اور آرزومند ہیں جو زخموں کو مندمل کرنیوالی اور شفا بخشنے والی ہے۔"

اخبار ہندو مدراس اپنے تنقیدی کالم میں لکھتا ہے :۔ "ڈاکٹر لطیف کی جدید انگریزی تصنیف اسلام کی صحیح توضیح و ترجمانی کرنے والی ان بہترین کتابوں میں سے ایک ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ موصوف ایک فکر صحیح اور نہایت ہی حساس بصیرت رکھنے والے مصنف ہیں۔"

ٹائمس آف انڈیا بمبئی رقمطراز ہے : "قرآنی اصول کی توجیہہ و تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر لطیف نے اپنے فکری توازن اور اپنے عمیق علمی تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی توجیہہ مشکوک و مشتبہ رجحانات اور ازمنہ وسطیٰ کے تاثرات سے پاک و مبرا ہے۔"

نواب سر نظامت جنگ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"آپ کو میری دعاؤں کی قطعاً ضرورت نہیں۔ بھلا میں آپ کو کیا دعا دے سکتا ہوں جبکہ آپنے اپنی خدمتِ اسلام سے اس ذات کی خوشنودی حاصل کر لی ہے جو سب سے اعلیٰ و ارفع ہے اور جس کا میں بھی ایک حقیر نغمہ سنج ہوں۔"

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی پرنسپل کلکتہ مدرسہ (عربک کالج) کلکتہ لکھتے ہیں : "آپ کی کتاب بلاشبہ خیال انگیز اور بصیرت افروز ہے۔ آپنے اس کتاب کے ذریعہ درحقیقت اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور عہد جدید کیلئے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ وہ اسلام کو اس کے

حیثیت سے ساری دنیا کو دعوتِ فکر دی ہے اور وہ طریقے اور راستے بتلائے ہیں جن پر چلکر ہر متنفس ایک متوازن زندگی کا حامل ہو سکتا ہے اور ابدی امن و سکون حاصل کر سکتا ہے۔ آپ نے بطورِ خاص تین اُمور یعنی احساس رب، وحدتِ انسانی اور سنت اللہ کے مطابق عمل پر زیادہ زور دیا ہے جنکا لازمی نتیجہ خشیتِ الٰہی، اپنے اور غیر کے حقوق کا تحفظ، باہمی ربط و اتحاد اور ایک پاکباز متوازن زندگی ہے۔ یہی وہ بنیادی اجزا ہیں جن سے صالح معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور ایک صالح معاشرہ کا وجود بلاشبہ دارین کے امن و سکون کا ضامن ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے یہ افکارِ عالیہ فوری اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسکا ایک نمایاں اثر یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد ہی سے اکثر جگہ سنجیدہ دماغ نئے انداز میں مصروفِ فکر نظر آنے لگے ہیں اور یہ بھی میں جانتا ہوں کہ ذی علم نوجوان طبقہ بھی جو بڑی حد تک اپنے مذہب سے برگشتہ اور بیزار ہو چکا تھا اور نئی روشنی سے متاثر ہو کر قریب تھا کہ وہ عہدِ حاضر کے نئے نظریوں سے بالکلیہ ہم آغوش ہو جائے، اب سوچنے اور اپنا آپ جائزہ لینے لگا ہے۔ یہ امید کیجا سکتی ہے کہ سنجیدہ افکار کی یہ بیداری ضرور مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ اس کتاب کا دوسرا اثر ان حلقوں میں نمایاں ہے جہاں عرصہ دراز سے اسلام کی غلط نمائندگی کیجاتی رہی ہے۔ بالخصوص مغربی دنیا کے مسیحی مبلغین اس وقت ایک حیرت انگیز عالمِ سکوت میں دوچار ہیں اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بلند پایہ تصنیف نہ صرف اسلام کی بہترین توضیح ثابت ہو رہی ہے بلکہ وہ ایک نہایت ہی موثر انداز میں ببانگِ دہل ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کر رہی ہے جو مسیحی مبلغین نے صدیوں سے

کرتے ہیں اور اپنے پڑھنے والے کو اپنے خلوص مقصد، اپنی وسعتِ نظر اور اپنے جامع اور غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر کیساتھ اپنا دعویٰ منوا دیتے ہیں۔"

الٰہ آباد کے مشہور ادبی نقاد ڈاکٹر حفیظ سیّد اپنے ریویو میں لکھتے ہیں:-

"ایک ایسے ساکت وصامت ماحول اور ایک ایسی تاریک فضا میں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ ایک وسیع دنیا کے مسلمانوں پر چھا گئی ہے، (ڈاکٹر لطیف کی) یہ کتاب گویا تازہ ہوا کا ایک جھونکا اور روشنی کی ایک کرن ہے۔"

مذکور الصدر آرا و تاثرات سے ڈاکٹر صاحب کی اس انگریزی تصنیف کی قدر و قیمت اور بلالحاظ مذہب و ملت اس کے قبول عام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس گراں قدر تصنیف کے ذریعہ اسلام کی ایک اہم اور شاندار خدمت انجام دی ہے اور اپنے مخصوص دلکش انداز میں ساری دنیا کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر اور تعلیماتِ قرآنی کی حقیقی روح کو پیش فرمایا ہے۔ عہد حاضر میں یہ کتاب درحقیقت اعلائے کلمۃ الحق کی ایک نہایت ہی بڑھیا اور کامیاب کوشش ہے۔ جہاں آپ نے مسلمانوں کو ان کا اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہوئے بطورِ خاص اس امر کی توجہ دلائی ہے کہ وہ خود اپنا آپ جائزہ لیں، اپنی بے راہ روی سے اغیار کو اسلام پر طعنہ زنی کرنیکا موقع نہ دیں اور صدیوں کے پڑے ہوئے حجابات کو اٹھا کر اسلام اور بانیٔ اسلام کی صحیح تصویر کو دیکھنے اور اپنے آپ کو اس سانچہ میں ڈھال لینے کی کوشش کریں جو قرآن کا پیش کردہ ہے، وہیں آپنے قرآنی پیام کے عالمگیر ہونے

نظام کالج کے شعبۂ اُردو و فارسی میں ریڈری کی خدمت پر فائز و کارگزار تھے۔ طالب علمی کے دور ہی میں انہوں نے اپنے خاص اندازِ بیان کی بدولت نمایاں حیثیت حاصل کرلی تھی۔ وہ ایک شاعر بھی تھے اور نقاد بھی۔ موسیقی سے انہیں خاص ربط تھا اور ستار کے اچھے بجانے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ ایک جاذب شخصیت کے حامل اور اپنے رفقائے کار اور طلباء میں ہر دلعزیز تھے۔ میں مختصراً ان کے ان خصوصیات کا اظہار کرتے ہوئے انکی عدم موجودگی کو بری طرح محسوس کر رہا ہوں۔ افسوس کہ وہ آج ہم میں نہیں ہیں۔

باقی مرحوم کے اچانک انتقال کی وجہ ڈاکٹر صاحب نے ان کا مسودہ دوسرے باب سے ساتویں باب تک اصل متن سے تقابل کیلئے بعض احباب کے حوالے کیا۔ وہ مقامات جو تشنہ اور باقی رہگئے تھے انکی بھی تکمیل کرلیگئی۔ اس سلسلہ میں مولوی اصغر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس اور انکی بیگم صاحبہ زہرا اصغر حسین ایم۔ اے نائب پرنسپل ٹریننگ کالج اور مولوی علی موسیٰ رضا صاحب مہاجر وظیفہ یاب صدر مدرس گلبرگہ ہائی اسکول بطور خاص شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان احباب نے ہمدردانہ توجہ فرما کر تقابل و تکمیل کا کام انجام دیا۔ دیباچہ اور پہلے باب کا ترجمہ اس ناچیز کا کیا ہوا ہے جو بجنسہٖ شریک کتاب کرلیا گیا ہے۔ طلوعِ اسلام کراچی نے عام فہم انداز میں آخری باب کا اسکا اپنا کیا ہوا ترجمہ شائع کیا تھا لیکن اس باب کے کچھ حصّوں کا ترجمہ رہ گیا تھا۔ طلوعِ اسلام کے ترجمہ کو بجنسہٖ باقی رکھتے ہوئے مابقی حصّوں کے ترجمہ کی تکمیل کرکے اسکو بھی شریکِ کتاب کرلیا گیا۔ انگریزی تصنیف میں قرآن و حدیث کے جو حوالے درج کئے گئے تھے ان تمام کا ترجمہ بھی باقی رہ گیا تھا۔ ناچیز نے اسکی تکمیل کردی۔ غرض اس طرح کتاب کے پورے ترجمہ کی

اسلام کے متعلق اپنے حلقہ ہائے اثر میں پھیلا رکھی تھی اس کتاب کا ایک نذیر اثر بھی ہے جو میدانِ سیاست میں کارفرما ہے اور دور رس نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تصنیف کے آخری ابواب میں وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں اور مغربی طاقتوں کو امن و اتحاد کے حصول کے سلسلہ میں انتباہ اور چند مفید مشورے بھی دئے تھے جو اب نتیجہ خیز ثابت ہو رہے ہیں۔ میں یہاں اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس انگریزی تصنیف کی اشاعت کے بعد ہی اسکے مطبوعہ نسخے مشرق وسطیٰ اور مغربی ممالک کے تمام سربرآوردہ مفکرین اور اربابِ حل و عقد کے پاس تحفۃً ارسال کئے گئے تھے جو ان حضرات کے زیر مطالعہ رہے اور جنہوں نے اپنے اپنے تاثرات سے قابل مصنف کو آگاہ بھی کیا۔ گزشتہ تین سال کے دوران میں مشرق وسطیٰ اور مغربی ممالک کی سیاسی دنیا میں جو تبدیلی آہستہ آہستہ رونما ہو رہی ہے اور باہمی ربط و اتحاد کی جو کوشش کیجا رہی ہیں وہ اربابِ بصیرت کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ وہ وقت دور نہیں جبکہ اس متوقع اتحاد کے تجزیہ اور اس کے اسباب و علل کی دریافت میں علی الاعلان اس حقیقت کو آشکار کرنا پڑیگا کہ اس اتحاد کی تکمیل اور ان کوششوں کی کامیابی میں منجملہ اور عناصر کے ڈاکٹر لطیف کی یہ بلند پایہ انگریزی تصنیف بھی ایک اہم عنصر رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تصنیف اور اسکی خوبیوں کے متعلق اور کیا عرض کروں صرف اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں ؎

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار ۔ گلچین بہار تو ز دامان گلہ دارد

ترجمہ کے تعلق سے یہاں فانی مرحوم کا مختصر تذکرہ بیجا نہ ہوگا۔ عبدالقیوم خاں صاحب فانی جامعہ عثمانیہ کے ہونہار سپوتوں میں سے تھے اور اپنے انتقال سے قبل تک

دیباچہ

ہم کو اپنی مختصر سی زندگی کے دوران ہی میں دو عالمگیر جنگوں کا تجربہ ہو چکا ہے اور اب ہم قدرتی طور پر ایک تیسری عالمگیر جنگ کے منتظر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ پہلی جنگ میں جو فتح مند ہوئے انہوں نے ساری جنگوں کے سلسلہ کو ختم کرنے کے متعلق باتیں کرنی شروع کیں اور مجلس اقوام کے نام سے امن کی ایک مشینری قائم کی۔ لیکن جب یہ مشینری بھی کچھ کارآمد ثابت نہ ہو سکی اور انہوں نے اپنے آپکو پھر ایک دوسری جنگ میں جو پہلے کے مقابلہ میں زیادہ سنگین اور خطرناک تھی، مصروف پایا اور جب اس میں دوبارہ کامیاب و کامران ہوئے تو پھر انہوں نے جنگوں کے خاتمہ کے متعلق اپنی سابقہ گفتگو کی طرف عود کیا اور اس اُمید کیساتھ کہ حالات میں ضرور بہتری پیدا ہو جائیگی اور دنیا امن کی طرف لوٹ آئیگی، مجلس اقوام متحدہ (یو، این، او) کے نام سے امن کی ایک دوسری مشینری قائم کی۔ لیکن یہ امن ہنوز قریب نظر ہے۔

سائنس کے کمالات اور اسکی کامیابیوں نے آج ہمارے لئے زمان و مکان کے قدیم قیود و موانع کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اس وسیع کرۂ ارض کو ایک ایسے چھوٹے سے مکان کی صورت میں محدود کر دیا ہے جہاں ہلکی سی سرگوشیاں بھی ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک برابر سنی جا سکتی ہیں۔ بنی نوع انسان کیلئے اس سے قبل ایسا بہتر موقع حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ باہم قریب تر ہو جائیں اور حضرت مسیحؑ کے تصوّر کے مطابق یہ ثابت کریں کہ

تکمیل ہوگئی۔ مولوی سید عبدالوکیل صاحب جعفری مولوی فاضل نے ازراہِ کرم اس اُردو ترجمہ کا اشاریہ مرتب فرمایا جس کے لئے وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

جیسا کہ میں اوپر عرض کرچکا ہوں ڈاکٹر لطیف کی کسی بھی انگریزی تصنیف کا ترجمہ واقعہ ہے کہ کوئی آسان کام نہیں۔ آپکا مخصوص اندازِ بیان ہی ایسا ہے کہ اس کے ترجمہ میں اکثر پختہ کار مترجمین بھی قلم ٹیک دینے پر مجبور ہوجاتے ہیں ڈاکٹر صاحب کے اس انگریزی شاہکار کا اُردو ترجمہ تو بطورِ خاص ایک کڑی آزمائش تھا میں اس اظہارِ حقیقت پر اس لئے مجبور ہوں کہ مجھے خود دیباچہ اور باب اول کے ترجمہ میں اس آزمائش سے عہدہ برآ ہونا پڑا ہے۔ باقی مرحوم نے واقعہ ہے کہ نہایت ہی جرأت آمیز اور حیرت انگیز طریقہ پر اس کام کی تکمیل کی۔ یہ ترجمہ خود ان کا ایک ادبی کارنامہ ہے۔ اس کا امکان ہے کہ بعض مقامات پر دوسروں کا اندازِ تحریر محسوس کیا جاسکے لیکن چونکہ کتاب کے بیشتر حصہ کا ترجمہ باقی مرحوم کا کیا ہوا ہے اور ان کا اندازِ تحریر نمایاں اور غالب ہے، اسی لئے اس ترجمہ کو باقی مرحوم ہی کے نام سے منسوب کرکے شائع کیا جارہا ہے۔ گو باقی ہم میں باقی نہیں لیکن یہ ترجمہ ضرور انکی یاد کو باقی رکھیگا۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے، آمین۔

المرقوم ۱۸ر نومبر ۱۹۵۵ء
حیدرآباد دکن

خاکسار
محمد راحت اللہ خاں

دُور کرے اور ان میں مفاہمت پیدا کرے، ہنوز کوئی ایسا نمایاں اقدام نہیں کیا ہے جس سے ان دونوں میں مصالحت اور ہم آہنگی پیدا ہو جانے کا امکان ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود مجلس کے آنکھوں کے سامنے روزانہ دن دھاڑے ہر دو جانب جنگی اسلحہ کے انبار لگ رہے ہیں۔ ایک "سرد جنگ" تو پہلے ہی سے جاری ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ آویزش قطعاً عام انسان کی معاشی اصلاح کی تائید میں نہیں اور فی الحقیقت یہاں کسی ایڈیولوجی یا اعلیٰ تصورِ حیات کا الجھاؤ بھی نہیں ہے۔ ہر حالت میں عام انسان تو ان دونوں فریقوں کا مرکزِ فکر ہے ہی نہیں۔ تو پھر آخر یہ سب کچھ کیوں؟ گو صورتِ حال کے پیشِ نظر میں اپنے آپکو ڈیوک آف آلبنی کی ہمنوائی کیلئے آمادہ نہیں پاتا جب کہ وہ شکسپیر کے ڈرامے کنگ لیر (King Lear) میں ماحول سے متاثر ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ "یہ وفت کی لعنت ہے کہ دیوانے اندھوں کی رہبری کر رہے ہیں" تاہم میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس صورتِ حال کا جواب اسی مقولے کے قرب و جوار میں کسی جگہ ضرور موجود ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ "نیکوکار (صالحین) اس زمین کے وارث ہونگے" یعنی وہ لوگ جو زندگی میں توازن قائم رکھتے ہیں اور اس کو ہر قسم کی بیجا اندوزی سے بچاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بحیثیت "نائب خدا" اس زمین پر اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور اس قانون کے اجراء و قیام کا باعث ہوتے ہیں جو کائنات میں کارفرما ہے۔ کہیں یہ تو نہیں کہ ہم میں اس قسم کی ہستیوں (صالحین) کا قحط ہے! کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آویزش دراصل ایک ایسی مسابقت ہے جو اندھوں کی رہبری کرنے والوں کے درمیان ہوا کرتی ہے۔

وہ تمام "اللہ کے بچے" ہیں یا پیغمبر اسلام کے ارشاد کے مطابق اس کا ثبوت دیں کہ وہ تمام ایک ہی خاندان کے افراد یعنی "عیال اللہ" ہیں جن میں "ہر فرد باہم ایک دوسرے کا بھائی ہے"۔ لیکن ہنوز یہ چھوٹا سا مکان منقسم حالت ہی میں قائم اور دو ایسی زبردست حریف قوتوں کا شکار بنا ہوا ہے جن میں سے ایک کی نمائندگی سوویٹ روس کرتا ہے تو دوسری کی ممالک متحدہ امریکہ اور تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی مجلس امن کے ارکان بھی ہیں۔

آخر یہ صورتِ حال کب تک برقرار رہیگی؟ کہا جاتا ہے کہ یہ آویزش دراصل تصوّرات کی آویزش ہے۔ کیا یہ امر واقعہ ہے؟ بلاشبہ روسیوں کے پاس بھی امریکیوں کی طرح امن کی ایسی اصطلاحات موجود ہیں جو ان کے فطری خوفِ جنگ اور تمنائے امن کا اظہار کرتی ہیں۔ روسی حکمراں بھی، دوسری جماعت کے ان ارباب حل و عقد کی طرح جو حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں، عوامی جمہوریت کی ہمنوائی کرتے ہیں اور انہی کے مماثل سامراجیوں اور جنگ بازوں سے یکساں تنفر کے مدعی نظر آتے ہیں۔ بہرحال ہر دو کا مقصد بظاہر عام انسان کیلئے ایک بلند معیارِ حیات کا حصول ہے۔ اگر مشترکہ طور پر نیک نیتی اور خیر سگالی کے جذبہ سے کام لیا جائے تو ایسے دو تصوّرات میں جن کا مقصد ایک ہی ہو، ہم آہنگی اور مصالحت ناممکن نہیں۔ اگر فی الحقیقت ہر جزو پر مصالحت ممکن نہ ہو سکے تو یقیناً یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہر دو تصوّرات ممکنہ تعاون اور رواداری کی اساس پر ساتھ ساتھ کام انجام دیسکیں۔ لیکن مجلس اقوامِ متحدہ نے جسکا فرضِ منصبی یہ تھا کہ وہ اپنے اراکین کی باہمی کشیدگی کو

(Secularism) کا بت نصب کر دیا گیا ہے گویا کہ غیر مذہبیت خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، بلا کسی روحانی اساس کے کوئی دیرپا چیز ہو سکتی ہے۔ انجام کار مذہب ہی کو اس کے لئے اس اساس عمل کا انتظام کرنا ہوگا، ورنہ بلا اساس روحانی یہ غیر مذہبیت، قومیت سے پیدا ہونے والی برائیوں کے اضافہ کا باعث ہوگی اور حیات انسانی کو اور زیادہ فاسد کر دیگی۔ آج انسان کا واحد ملجا یہی ہے کہ وہ ہر مذہب کے اتحادی عنصر کی طرف لوٹ آئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ اصل مذہب سے حشو و زوائد کو علیحدہ کر دیا جائے۔ مذہب جس وحدت ربانی پر زور دیتا ہے اس کو قرآن کے منشاء کے مطابق وحدت انسانی یا انسان کیلئے ایک پُر امن نظام حیات کی صورت میں رونما ہونا چاہیئے۔ یہی اس کا صحیح فریضہ ہے۔ وہ لوگ جو اس نقطہ نظر کے حامی ہیں ان کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے اپنے مختلف مذاہب کی ان امکانی قوتوں کا جو ان میں مضمر ہیں، مطالعہ کریں اور انکو منظر عام پر لے آئیں تاکہ اس نگہبانی کرنے والے ذہن کو ترقی دی جا سکے جس کی آج دنیا کو ضرورت ہے۔ نیز دنیا کے ہر گوشہ میں مصلحین کی ایک ایسی جماعت پیدا کریں جو متفقہ طور پر اپنی مساعی سے حیات انسانی کو اس کا کھویا ہوا توازن واپس دلانے اور ایک متحد دنیا کو معرض وجود میں لانے کیلئے راہ ہموار کر سکے۔

چونکہ میں قرآن کے دیس میں پیدا ہوا ہوں اور میں نے اسی کے ماحول میں نشو و نما پائی ہے اس لئے یہ امر میرے لئے فطری اور آسان تھا کہ میں قرآن کے مہیا کردہ امکانات کا جن سے آج کی دنیا کیلئے اس نگہبانی کرنے والے ذہن کو تشکیل دیا جا سکتا ہے، مطالعہ کروں۔ میرا یہ مطالعہ فی الحقیقت ایک [illegible] امعانِ نفس ہے اور اس سے مقصد

آج کل ہر جگہ مسلک قومیت ایک بانکپن کے ساتھ کچھ اس طرح سرگرم خرام ہے کہ وہ مخصوص اقوام کے اغراض و مقاصد کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس اہمیت کو مساوی طور پر بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کے اغراض و مقاصد تک وسعت دینے کیلئے آمادہ نہیں۔ عہد حاضر کی جمہوریت کے تار و پود میں خلط ملط ہو کر اس مسلک نے حق رائے دہی کے جمہوری اصول کو ایک پست اور گھٹیا صورت دیدی اور صالحین کے برسر عروج آنے اور اپنے اپنے ملکوں کے معاملات کی قیادت و رہنمائی کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالدی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو پیغمبر اسلام کے تصور کے مطابق ایک متحد دنیا ہونے اور ایک ایسی جماعت بننے سے باز رکھا جس کا "ہر فرد ہر دوسرے فرد کا محافظ و نگہبان اور پوری جماعت کی فلاح و بہبود کا جواب دہ ہو"۔ مجلس اقوام متحدہ کو کامیاب بنانے کیلئے آج ہمیں ایک ایسے ہی نگہبانی کرنے والے ذہن کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ مجلس بھی وہی راہ اختیار کریگی جو اس کے اسلاف نے اختیار کی تھی اور بین الاقوامی جاسوسی کے ایک اڈے کی طرح تھوڑی سی اکڑفوں کے بعد ختم ہو جائیگی۔ اتحاد و تمدن کے مفادات کی راہ میں سرمایہ داری یا اس کے شدید ردعمل کا نتیجہ یعنی اشتراکیت میں سے کوئی ایک ہی حائل نہیں بلکہ ان دونوں کا شدید تفاعل ہی جنکی پشت پناہی بھی مشترک جذبۂ قومیت کر رہا ہے، دراصل اس راہ میں حائل ہے۔

اس برائی کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنا یا اس کو انسانیت آموز بنانا یہ ایک مذہبی فریضہ ہے اور یہ مذاہب عالم ہی کا کام ہے کہ وہ اس فریضہ کی انجام دہی میں صحیح راہبری کریں۔ کچھ عرصہ سے ان مذاہب کو پس پشت ڈالا گیا ہے اور انکی جگہ پر غیر مذہبیت

عزائم کی اہمیت کو محسوس فرماتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے میرے اندازِ فکر اور خیالات سے جو قرآن کے پیش کردہ اساسی مسائل حیات سے وابستہ رہے ہیں، ہمیشہ ہمدردانہ رجحان کا اظہار فرمایا اور میری ہمت افزائی فرمائی۔ دوسرے دوست جن کا میں ممنون ہوں ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب (یم، اے) عثمانیہ (ڈی فل۔ لیپزگ) کیوریٹر کتب خانہ آصفیہ ہیں۔ آپ اُن جدید مسلم ارباب علم میں سے ہیں جو ہمارے قرون وسطیٰ کے مذہبی ورثہ سے پوری ہمدردی نہیں رکھتے اور ساتھ ہی ساتھ تہذیب جدید کے رجحانات سے بھی مطمئن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ انگریزی میں میرے شاگرد رہ چکے ہیں اور انہوں نے اپنے استاد کے ساتھ اپنے قدیم جذبۂ محبت کو علیٰ حالہ برقرار رکھا ہے۔ میرے اس کام کی دشواریوں کا آپ کو عمیق احساس رہا ہے اور آپ نے میرے لئے کتب خانہ آصفیہ میں جہاں میرے کام کا بیشتر حصہ تکمیل پایا، ہر قسم کی سہولتیں فراہم کیں۔ میں بخوشی اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ عربی ادب سے متعلق جو ان کے تحصیل علمی کا خاص موضوع رہا ہے، میں نے ان کی وسیع اور متنوع معلومات سے آزادی کے ساتھ استفادہ کیا ہے۔

گو مجھے اپنے مقالہ کی پیشکشی میں ان دو احباب کی ہمدردیوں کا بخوبی احساس ہے تاہم میرے لئے یہ امر قرین انصاف نہ ہوگا کہ میں انہیں بھی اس ذمہ داری میں شریک کروں جو ان افکار و آراء کے اظہار سے جو اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں، عائد ہوتی ہے، ان افکار کا صرف میں ہی تنہا ذمہ دار ہوں کیونکہ یہ افکار حقیقتاً میرے ہی ساتھ نشوونما پائے ہیں اور اب تو یہ میرا ایک جزو حیات بن چکے ہیں۔

ان اقدارِ حیات کی یاد دہانی ہے جنکو میرے ہم مذہب بھائیوں نے مُرورِ زمانہ کے ساتھ بڑی حد تک اپنے سے علیحدہ کر دیا ہے۔ میں نے اس کام کو نہایت ہی انکسار اور اپنے حدود کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے اختیار کیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس جستجو کے دوران میں مجھے بڑی نازک راہوں سے گزرنا پڑا اور اُن جذبات سے بھی عہدہ برآ ہونا پڑا جن کو میرے بھائیوں نے اپنے سینوں کی گہرائی میں جگہ دے رکھی ہے۔ میرے اس عمل کی تائید میں صرف ایک ہی چیز ہے اور وہ میرے اپنے دل کی یہ لگن ہے کہ میں جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکے اُن حجابات کو اُٹھاؤں جنکو عرصۂ دراز سے قرآن پر پڑے رہنے دیا گیا ہے، تاکہ قرونِ وسطیٰ کے غیر قرآنی اثرات سے آزاد ہو کر قرآن اپنا پیام خود اپنے انداز میں سنا سکے۔ اب ان اربابِ علم کا جو بہتر صلاحیتوں کے حامل ہونے کے باوجود اس وقت تک خاموش رہے ہیں، یہ فریضہ ہے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لیں، اور ذہن کی اُس تصویر کی تصحیح، توسیع اور تکمیل کریں جس کا خاکہ میں نے یہاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور جسکو قرآن انسان کیلئے تشکیل دینا چاہتا ہے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں میں اپنے دو احباب کا شکر گزار ہوں جن سے مجھے گراں قدر مدد ملی۔ ایک میرے قدیم رفیق اور جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کے پروفیسر علامہ عبدالقدیر صاحب صدیقی ہیں جو عرصہ دراز تک اسلامی شعبۂ تعلیمات کے صدر رہے ہیں اور جنکے قرآنی علم کی ہمیشہ میرے دل میں بڑی وقعت رہی ہے۔ گو آپ قدیم طرز کے علماء کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن بایں ہمہ آپ اس خوبی کے بھی حامل ہیں کہ علومِ دینیہ کے سرچشموں تک پہنچنے کیلئے نئے اسلوب سے فکر کرنے والوں کے

باب اوّل

قرآن قرونِ وسطیٰ کے شکنجہ میں

آج تقریباً دنیا کے ہر گوشہ میں ذہنِ مسلم ایک متاعِ کاسد قرار دیا جا رہا ہے۔ اسکی اپنی اختیار کردہ زندگی اور اُس زندگی میں جس کے اختیار کرنے کی قرآن اس کو تاکید کرتا ہے، ایک فصل ہے۔ قرآن کا منشاء ہے کہ وہ اپنے لئے مخصوص سماجی اور سیاسی اداروں کی بناء ڈالے لیکن ان قرآنی اداروں اور ان اداروں میں جن کی خود اس نے اپنے لئے بناء ڈالی اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کو آگے بڑھایا، ایک فصل ہے۔ عہدِ حاضر کے مسلمانوں کے مقصد اور قرآن کے ابدی مقصد میں جو بالکلیہ عالمی مقصد ہے، ایک فصل ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن کی عالمگیر انسانیت اور عہدِ حاضر کے مسلمانوں کی تخصیصی مذہبیت ہر دو میں ایک بڑا فصل ہے۔ اگر کوئی اُن لوگوں کی زندگیوں کا تجزیہ کرے جو دوسری مقدس مذہبی کتابوں پر اعتقاد رکھنے کے مدعی ہیں اور بہتر ہوگا کہ ہر مذہب کا کوئی مخلص پیرو اس کام کو اپنے ذمہ لے، تو ہمیں کوئی تعجب نہ ہوگا اگر اس کو بھی ان میں اسی قسم کے فصل نظر آئیں۔

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں خلیفہ حضرت عمرؓ کی زندگی کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے[1]۔ حضرت عمرؓ مدینہ سے مکہ تشریف لیجا رہے تھے۔ اثنائے سفر میں

آخر میں میں ڈاکٹر یوسف الدین صاحب ریڈر شعبۂ ثقافت و تہذیب جامعۂ عثمانیہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بڑی احتیاط سے اس کتاب (انگریزی تصنیف) کا اشاریہ مرتب کیا۔

سید عبد اللطیف

اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے"[۱۲] اور یہ کہ "کوئی تین آدمی باہم چپکے چپکے گفتگو نہیں کرتے مگر یہ کہ اللہ ان میں چوتھا ہے اور نہ کوئی پانچ مگر یہ کہ اللہ ان میں چھٹا ہے، اور نہ کم اور نہ زیادہ لیکن جہاں کہیں بھی وہ ہوں اللہ ان کے ساتھ ہے"[۱۳] اس نے یہ بھی ضرور سنا ہوگا کہ کوئی شخص کسی ایسی چیز کو جو اس کی اپنی نہیں ہے، نہ تو کسی دوسرے کو دے سکتا ہے اور نہ اس کو فروخت کر سکتا ہے۔ اس حبشی لڑکے کے جواب نے حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر اور سخت گیر خلیفہ کے ذہن پر جو اثر مرتب کیا ہوگا اس کا بآسانی تصور کیا جا سکتا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ آپکے رخسار پہ آنسو ڈھلک آئے۔ آپ نے شفقت کے ساتھ اس لڑکے سے کہا کہ مجھے اپنے مجازی آقا کے پاس لے چل جو اس غلام کا مالک ہے۔ اس کے آقا سے ملنے پر آپ نے دریافت فرمایا "تم نے اس غلام کی کیا قیمت ادا کی ہے"؟ "اس قدر" اس کے مالک نے جواب دیا "لے لو"، فرمایا حضرت عمرؓ نے "میں اس قدر قیمت لے لو اور اس لڑکے کو آزاد کر دو"۔ لڑکا تو آزاد ہو گیا اور حضرت عمرؓ نے اپنی راہ لی۔ لیکن سوال یہ رہ جاتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر مسلک میں ہم میں سے کتنوں نے خواہ مسلم ہوں کہ غیر مسلم، ہماری جامعات کی پیدا کردہ کتنی ایسی ذہین اور قابل ہستیوں نے، نیز اُن میں سے کتنے ایسے افراد نے جو آج اپنے اپنے ملکوں کی عنان حکومت سنبھالے ہوئے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ ان میں سے کتنوں نے جو منشور اقوام متحدہ اور حقوق انسانی کے عالمگیر اعلان پر اپنے دستخط ثبت کئے ہیں، ذہن کے اس مرتبہ یا اُس حالت تک رسائی حاصل کر لی ہے جس پر یہ حبشی لڑکا آج سے تیرہ سو سال قبل پہنچ چکا تھا یا

ایک دن علی الصباح آپ نے ایک پہاڑی کے دامن میں بھیڑوں کا ایک گلہ دیکھا۔ ایک حبشی لڑکا اسکی رکھوالی کر رہا تھا۔ یہ معلوم کرنے کی خاطر کہ آیا تعلیمات قرآنی کم از کم اپنی عمومی شکل ہی میں سہی، ملک عرب کے اس دورِ افتادہ گوشہ میں رہنے والے اس حبشی لڑکے تک پہنچی ہیں یا نہیں اور اگر پہنچی ہیں تو اس لڑکے نے اپنی انفرادی زندگی میں کہاں تک ان تعلیماتِ قرآنی کے اثر کو قبول کیا ہے، آپ نے اس لڑکے سے پوچھا کہ کیا وہ اس گلہ کی ایک بھیڑ فروخت کریگا۔ اس لڑکے نے قطعیت کے ساتھ فوراً جواب میں کہا "نہیں"۔ "آخر کیوں نہیں" خلیفہ نے پوچھا۔ لڑکے نے جواب دیا "اس لئے نہیں کہ یہ بھیڑیں میری نہیں بلکہ میرے آقا کی ہیں اور میں اس کا غلام ہوں"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "کیا مضائقہ ہے؟ لو یہ رقم لو اور ایک بھیڑ مجھے دیدو اور اپنے آقا سے جاکر کہدو کہ کوئی بھیڑیا اس کی ایک بھیڑ اٹھا لے گیا ہے"۔ یہ سن کر اس لڑکے نے اپنی نظریں خلیفہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس غریب کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس ہستی کو اس طرح گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اسی حالت میں اس لڑکے نے زوروں سے کہا "میں اپنے آقا کو جو پہاڑی کے اس جانب ہے دھوکا تو دیسکتا ہوں لیکن کیا میں اس بڑے آقا کو بھی جو ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہماری باتوں کو سن رہا ہے اسی طرح دھوکا دیسکتا ہوں"۔ یہ لڑکا ایک ان پڑھ لڑکا تھا۔ اس نے قرآن کی کبھی بھی تلاوت نہیں کی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کے ماحول کا اثر اس کے ذہن تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی انداز میں ضرور یہ قرآنی الفاظ سنے ہونگے کہ "اللہ اس سرگوشی کو بھی جانتا ہے جو آدمی کا نفس اسکے ساتھ کرتا ہے"، اور یہ کہ "اللہ آدمی سے

بھی جس کا آغاز بحیثیت ایک انتخابی ادارہ کے ہوا تھا، بہت جلد ایک خود مختار موروثی شاہی میں متبدل ہوگئی۔ اس تغیر اور اس عبوری دور کی نمایاں خصوصیت باہمی خانہ جنگیاں تھیں مسئلہ خلافت اس سارے جھگڑے کا سبب تھا۔ چونکہ اس منصب کیلئے بلحاظ اسکی ہیئت کے مخصوص مذہبی فرائض کی انجام دہی ضروری تھی، اس لئے اس کشمکش نے قدرتی طور پر مذہبی صورت اختیار کرلی۔ نیتوں کی جانچ اور ذمہ داریوں کے تعین کا یہ محل نہیں۔ درمیانی تکلیف دہ صدیوں کو عبور کرکے ان چیزوں کی خواہ مخواہ کھوج کرنا کوئی سود مند فعل نہیں۔ بہرحال نتیجتاً اسلام فرقہ بندی میں مبتلا ہوگیا۔ خانہ جنگیوں کے دوران میں قرآنی تصورات سے گریز کرنے کا جو رجحان پیدا ہو چلا تھا وہ اموی اور عباسی عہد کی موروثی خاندانی خلافت کے دور میں شدید تر ہوگیا اور دیگر بیرونی ثقافتی اثرات سے خلط ملط ہوکر یہ رجحان اسلام کے روایتی بہتّر فرقوں کے روپ میں نمایاں ہوا۔ اس رجحان کے شاخسانے کے طور پر و نیز اس کو پرورش کرنیوالی قوت کی حیثیت سے مختلف فرقوں کے سرگرم طرفداروں میں یہ عام میلان پیدا ہوا کہ جہاں استدلال عاجز آجائے وہاں رسول کریم صلعم کے نام کا سہارا لیا جائے اور اپنے حریفانہ دعاوی اور نقاطِ نظر کی تائید میں ایسے اقوال و افعال کو رسول کریم صلعم سے منسوب کیا جائے جو بالکلیہ انہی کے زرخیز متخیلہ کے پیداوار تھے۔ چنانچہ اس قسم کے قصوں کے گھڑے جانے کی تیز رفتاری کو دیکھکر پیروان اسلام کے سنجیدہ افراد گھبرا اٹھے۔ انھوں نے اس میلان کے سدباب کا بیڑا اٹھایا اور قرآن اور رسول کریم صلعم کی تصویر کو مسخ ہونے سے

اس حبشی لڑکے کی طرح ذاتِ باری کا احساس کیا ہے اور اپنے آپکو اپنے رب کے سامنے ان تمام اُمور میں جو انہوں نے اپنی مختلف زندگیوں میں سوچے یا کئے ہوں ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔

یہی وہ احساسِ ذاتِ باری ہے جسکو قرآن قلبِ انسانی میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسی پر معاشرہ کا ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں سماج کا ہر فرد "ہر دوسرے فرد کا محافظ و نگہبان" ہو سکے، گویا ایک ایسی برادری اور بھائی چارگی قائم ہو جو اپنی انتہائی وسعت میں بلا لحاظ زماں و مکاں جمیع بنی نوع انسان پر جو درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق "عیال اللہ" ہیں، حاوی ہو۔ مملکت مدینہ جس کی نبی کریم صلعم نے تشکیل فرمائی اور جو بعد میں خلفائے اسلام کو ورثہ میں ملی، اس کی نشوونما ابتداءً ایسے جمہوری نظریہ کے تحت عمل میں آئی جو اپنی ترکیب اور ہیئت کے اعتبار سے بنیادی طور پر قدیم یونانیوں کے جمہوری نظریہ سے بالکل مختلف تھا۔ یہ جمہوری نظام ایسے منفرد اشخاص پر مشتمل تھا جنہوں نے فطرتِ انسانی کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے باہمی فضیلت کیلئے بجز حیاتِ صالح کے کسی اور معیار کو تسلیم نہیں کیا اور جن کا سنجیدہ مقصد یہ تھا کہ فطرتِ انسانی کے مادی اور روحانی تقاضوں میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے اور زندگی میں ایک ایسی روح پھونکی جائے کہ وہ جمیع بنی نوع انسان کیلئے ایک متحدہ مسرت کو رونما کر سکے۔

بہرحال یہ جمہوری نظام زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکا جوں ہی کہ یہ مملکت حدودِ عرب سے آگے پھیلی اور اس نے ایک سلطنت کی صورت اختیار کر لی، تو وہ خلافت

اس کا مقصد یہی تھا کہ یہ ذخیرہ قرآن کے ان احکام و اوامر کے تعلق سے جنکو بطور کلیہ بیان کیا گیا ہے، نبی کریم صلعم کے عمل کی یادداشت کا کام دیسکے۔ اسکا مقصد احکام الٰہی کی توضیح و تشریح بھی تھی اور یہ بتانا بھی تھا کہ وحدتِ امت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان نئے حالات میں جو پیروان اسلام کی زندگی میں پیدا ہوں کس طرح انکو روبہ عمل لایا جاسکے۔ لیکن جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا گیا ہے، بہت جلد کسی نہ کسی رجحان کے تحت اسکے مآل پر غور کئے بغیر اس مقصد میں اتنی وسعت پیدا کر دیگئی کہ بالآخر نبی کریم صلعم کے وصال کے تین سو سال کے اندر ہی روایات کا یہ جدید ذخیرہ قانون، دینیات اور رسم و رواج کے ایسے متعدد مکمل "مذاہب" کی تکوین کا باعث بنا جن میں سے ہر ایک کو اسلام کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ حالانکہ ان میں سے ایک بھی بعینہ وہ اسلام نہ تھا جسکو نبی کریم صلعم نے اپنے مکہ کے وداعی خطبہ میں بطور امانت مسلمانوں کے سپرد فرمایا تھا۔ اس طرح قرآن کا یہ دین جس نے اپنے متبعین کو یہ تلقین کی تھی کہ "اللہ کی رسّی کو باہم ملکر مضبوط پکڑے رہو"، اور ایک متحدہ زندگی بسر کرو خود اسکے ماننے کا دعویٰ کرنیوالوں کے ہاتھوں امت کے انتشار اور اسکی منقسم زندگی کا آلہ کار بن گیا۔

طرفہ یہ کہ اس دور میں جبکہ اولاً قرآن کی تشریح اور تفسیر کا آغاز ہوا، قرآن کے اس مقصد اور جوہر کا جو اسکے اندازِ بیان میں مضمر تھا، حقیقی ادراک نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ان ابتدائی تفاسیر میں بسا اوقات محکمات یعنی وہ آیات جنکا مفہوم صریح اور واضح ہے اور متشابہات و امثال یعنی وہ آیات جن میں تمثیل و استعارہ سے کام لیا گیا ہے، ہر دو میں کوئی خصوصی فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا حالانکہ قرآن اسکے

بچانے کا تہیہ کرلیا۔ یہ کام کس قدر مشکل تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جب امام بخاریؒ نے تحقیق و تفتیش کے ساتھ اصل اور مستند احادیث کو موضوع اور غیر مستند احادیث سے علیحدہ کرنا اور صحیح احادیث کو مدوّن کرنا شروع کیا تو انہیں ان چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو حسبِ روایت ابن خاکان ان کے دائرہ وقوف میں آئیں، ایک روایت کے موجب صرف (۷۳۹۷) اور دوسری روایت کے بموجب (۷۲۹۵) حدیثوں کے سوا باقی تمام روایات کو جعلی اور ناقابل اعتبار قرار دیکر خارج کردینا پڑا۔ اور پھر مختلف ابواب سے اگر مکررات کو علیحدہ کردیا جائے تو صحیح احادیث کی یہ تعداد گھٹ کر صرف (۲۷۶۲) رہ جاتی ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنے انتخاب کا جو معیار مقرر کیا وہ زیادہ تر رواۃ حدیث کی راست گوئی پر مبنی تھا نہ کہ متن حدیث کی نوعیت پر۔ اور اس سے شائد ان کا یہی مقصد تھا کہ مستند و معتبر رواۃ کی فہرست سے ان تمام غیر مستند رواۃ کو خارج کردیا جائے جنہوں نے جعلی حدیثیں تراشنا اپنا پیشہ بنالیا تھا۔ پھر بھی اس احتیاط اور دیانت داری کے باوجود جو رواۃ کے انتخاب میں برتی گئی، داخلی شہادت کی بناء پر یہ کہنے کی معقول گنجائش موجود ہے کہ امام بخاریؒ اور انکے ہم شمار محدثین کے مجموعۂ احادیث میں ہنوز چند ایسی بھی روایات موجود ہیں کہ اگر ان کو صحیح اور قابل تسلیم قرار دینا ہی ہے تو ضروری ہوگا کہ سائنٹیفک علمی طریقہ تحقیق سے انکی صحت کی توثیق کرلی جائے۔

عام طور پر احادیث کو قرآن کے بعد سب سے زیادہ اہم اور متبرک قرار دیا جاتا ہے۔ اور بعض حلقوں میں تو ان کو قرآن پر بھی ترجیح دیجاتی ہے۔ ابتداءً

پائی جاتی ہے اور اسی طرح ضرورت ہے کہ قرآن کے موقتی اور دوامی ہدایات میں بھی فرق کیا جائے۔

لیکن آج مسلمانوں کو اس خالص نتیجہ سے جو عہد ماضی کے متروکہ کی شکل میں جو کچھ اور جیسا کچھ بھی ان کو ملا، ہر حالت میں دوچار ہونا ہے۔ آج سے ہزار سال قبل غور وفکر کے جن خطوط کی داغ بیل ڈالی گئی تھی، ان ہی خطوط نے باوجود ان اصلاحی کوششوں کے جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے ذہن کو قرآنی قالب میں ڈھالنے کیلئے کی گئیں، مسلمانوں کے انداز فکر اور ان کی تاریخ کو بُری طرح متاثر کر دیا۔ مسلمانوں کے گھروں میں قرآن عام طور پر طوطے کی طرح پڑھا جاتا ہے۔ ہر ہفتہ مساجد میں قرآن کی توضیح وتشریح کیجاتی ہے۔ قرآن کی زبان کو روزانہ نماز میں دہرایا اور استعمال کیا جاتا ہے لیکن جو کچھ پڑھا اور دُہرایا جاتا ہے یا جس کی تشریح وتوضیح کیجاتی ہے اس کا مفہوم ہمیشہ قرآن کا اصلی مفہوم نہیں ہوتا بلکہ وہ مفہوم ہوتا ہے جو قرون وسطیٰ کے اموی وعباسی عہد میں ابتداءً قرآنی آیات کو دیا گیا۔ آج وہ مذہب جو مذہب اسلام کے نام سے موسوم ہے اور جو تمام اسلامی ممالک میں عوام اور حاکم طبقے کا مذہب ہے درحقیقت وہ قرون وسطیٰ کا اسلام ہے اور بعینہٖ وہ اسلام نہیں جو قرآن اور پیغمبر اسلام کا تھا۔ اس کا ظاہری ڈھانچہ گو آشفتہ حال ہی سہی، موجود ضرور ہے لیکن اس کی روح بنیادی خصوصیات کے اعتبار سے غیر قرآنی ہے۔ ایسی صورت میں بجز ان مستثنیات کے جو ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہیں اور جن کا وجود عظمتِ حیات اور لذتِ زندگی کا موجب ہے، اگر یہ کہا جائے تو کوئی حیرت اور تعجب کا مقام نہیں کہ عہد حاضر کے مسلمانوں کا ذہن قطعاً اس وضع کا

اپنے پڑھنے والوں کو ان ہر دو کے اندازِ بیان میں صحیح تمیز کی ہدایت کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان عربوں اور عجمیوں نے جو ابتداءً مشرف بہ اسلام ہوئے اور جن میں سے مفسرین بھی نکلے، قرآنی اعتقاد و عمل کے بنیادی اجزاء کو عرب و عجم کے مروجہ قبائلی اور جماعتی اعتقادات و رسوم و رواج کی روشنی میں دیکھنا شروع کیا اور قرآن کے مجازی و تمثیلی عنصر کی یا تو لغوی معنی کے اعتبار سے وضاحت کی یا اس طرح اس کی توجیہہ کی کہ وہ پیغام قرآنی کے حقیقی مفہوم اور اصل منشاء کے مغائر تھی۔ یہ اثر پذیری کچھ تو بلحاظِ نوعیت مشرکانہ ہے جو ان تشبیہی و تجسیمی اشارات میں نمایاں ہے جو ذاتِ باری اور اس کے صفات کے تصور کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور کچھ تو بلحاظِ اہمیت متصوفانہ ہے جو بڑی حد تک اشراقیت کی پیداوار ہے اور جو بطورِ خاص اس غیر عرب یا عجمی کوشش میں نمایاں ہے کہ قرآن میں جو کچھ درحقیقت صاف اور عام فہم ہے اس کو رازِ سربستہ اور علم لدُن سے تعبیر کیا جائے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ برتری اور شہنشاہیت کے احساس نے جو عربوں کے ذہنوں میں ان کی اپنی تیز رفتار فتوحات کی بدولت پیدا ہو چکا تھا، اس رجحان کو مزید تقویت دی کہ قرآن و حدیث کی ان عبارتوں کو جو عربوں کے اس زمانے کے خاص رسم و رواج یا نیم علم کی زندگی کے عارضی واقعات سے تعلق رکھتی ہیں، یہ اثر اور قوت دیجائے کہ وہ کلی اور عالمگیر حیثیت سے ہر زمانہ اور ہر حالت میں زندگی پر منطبق کیجا سکیں۔ اس لحاظ سے قرآنی لفظیات اور اس کے اسلوب بیان کے میدان تشریح و توضیح میں بھی علمی اور اصولی تحقیق کی آج اتنی ہی شدید ضرورت ہے جتنی کہ میدان روایات میں

بالخصوص عہد حاضر میں اپنے لئے تشکیل دیسکے اور نہایت ہی اعتماد کے ساتھ ان اہم اور پیچیدہ مسائل کا مقابلہ کرسکے جن سے آج بنی نوع انسان دوچار ہیں۔ گو میرا خطاب بالخصوص ان حضرات سے ہے جو قرآن کے پیرو ہونے کے دعویدار ہیں لیکن درحقیقت میری یہ اپیل بحیثیت انسان کے فہم انسانی سے ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ دوسروں میں بھی امعان نفس کی کیفیت کو بیدار کردیا جائے اس لئے کہ آج مسلمان جس مرض کا شکار ہوچکا ہے وہی مرض کسی نہ کسی صورت میں تمام بنی نوع انسان کو اپنی مضبوط گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ میں اپنے مضمون کی پیشکشی میں حتی الوسع فنی اصطلاحات کے استعمال سے احتراز کرونگا اور یہ محض اس لئے کہ قرآن نے خود اپنے انداز بیان میں کسی فنی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا ہے اور اس کا اسلوب ہی ایسا ہے کہ وہ اُس اَن پڑھ حبشی لڑکے کیلئے بھی جو بحیثیت ایک غلام کے بھیڑوں کے گلہ کی رکھوالی کررہا ہے، قابل فہم ہے۔

ذہن نہیں جس کی اُس غریب اَن پڑھ حبشی لڑکے نے حضرت عمرؓ کے عہد میں اپنے محدود دائرہ زندگی ہی میں سہی نمائندگی کرنے کی کوشش کی تھی۔

بلاشبہ مسلمانوں کے عہد وسطیٰ کی تاریخ بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس عہد میں ادب و فلسفہ اور علوم و فنون میں بیحد ترقی ہوئی۔ لیکن یہ ترقی مسلمانوں کی روزمرہ زندگی سے کوئی نامیاتی رابطہ نہیں رکھتی تھی۔ یہ ترقی بطور خاص اس عہد کے محدود علمی طبقہ سے متعلق تھی اور عوام کی روزمرہ سماجی اور مذہبی زندگی سے اس کا بہت کم تعلق تھا جن کو جہالت میں رکھا گیا تھا اور جو اس عہد کے ان تنگ نظر مذہبی پیشواؤں کے آلہ کار بنے ہوئے تھے جن میں سے اکثر ان مستبد و خود مختار حکمرانوں کے وظیفہ خوار تھے جن کے سیاسی اغراض و مقاصد کی تائید و تکمیل ان کا فرض منصبی تھا۔ از منہ وسطیٰ کا یہ ذہن بڑے ہی اطمینان کے ساتھ زندگی کے منازل طے کرتا رہا اور آج بھی اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں اپنے مقامی خصوصیات کو لئے ہوئے کارفرما ہے۔

یہاں میرا یہ مقصد نہیں کہ میں اس ذہن کے ارتقاء کی تاریخ بیان کروں اگرچہ میرے لئے سلسلہ بحث میں تاکید و توضیح کی خاطر کہیں کہیں اس کی نمایاں خصوصیات اور نشانات راہ کی طرف ایک سرسری اشارہ کرنا ضروری ہوگا۔ اسکے برخلاف میں قرآن اور نبی کریم صلعم کی زندگی کے صحیح اور غیر متنازع فیہ واقعات کی روشنی میں اپنی محدود بساط کے مطابق ذہن انسانی کی ایک مختصر تصویر پیش کرنے کی کوشش کرونگا جس کو انسان اپنے اغراض و مقاصد حیات کے پیش نظر ہر وقت اور

غیر مذہبی تصورِ حیات سے ماورا ہے، اس قرآنی نظریہ پر مبنی ہے کہ موت زندگی کے اختتام کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک دروازہ ہے اُس عمل کی جولانگاہ کا جو تعمیرِ انسانیت کی ایک اور منزل کا پتہ دیتی ہے۔ یہی وہ جولانگاہ حیات ہے جس کے متعلق قرآن کا یہ قطعی وعدہ ہے۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ سورہ انشقاق۔ آیۃ (۱۹) یعنی تمکو ایک پست حالت سے برتر حالت کی طرف لے جایا جائیگا۔ قرآن کا یہ وعدہ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ لامتناہی امکانات کا ایک میدان کھول دیتا ہے جس میں دوسری زندگی پہلی زندگی کا ثمر ہوتی ہے۔ اسی تسلسل حیات کے ابدی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر موجودہ زندگی کے انداز کا تعین کرنا ہے۔ چنانچہ قرآن جس ذہن کی تعمیر چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان دنیا اور عقبیٰ کو ایک تسلسل دیکھے اور اسے ایک عنصر واحد سمجھ کر اپنے اعمال و افعال کو اس کے مطابق بنائے چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۝ سورہ لقمان آیۃ (۲۸) "تمہاری تخلیق اور تمہاری حیات بعد الموت ایک لمحہ کی طرح ہے"۔

اس ذہن کی تعمیر اور میدان حیات میں اس کا مظاہرہ جو قرآن کا کامل نصابِ تہذیب ہے، ایک چھوٹے سے فقرے میں بند ہے۔ "آمنوا وعملوا الصالحات" (ایمان لاؤ اور نیک عمل کرو)۔ جس ذہن کو قرآن پسند کرتا ہے اسکی تعمیر کی یہی ایک راہ ہے۔ اس طرح ایمان ایک ایسی قوت بن جاتا ہے جو ذہن انسانی کو رنگ دیتا اور اس میں ایک کیفیت عمل پیدا کرتا ہے اور جو عمل اس کے مطابق ہوتا ہے وہ گویا ایمان ہی کا ایک متحرک عکس ہے۔ یہاں یہ امر غور طلب ہو جاتا ہے کہ آخر ذہن انسانی کو پالنے والے وہ کونسے امور یا عقائد ہیں جو عمل صالح کی رہبری کے سرچشمے قرار دئے جا سکتے ہیں۔

باب دوم

لنگرگاہ

قرآن مجید در اصل انسانی کردار و عمل کا ایک ضابطہ ہے۔ یہ وہ ادعا ہے جو خود اس کتاب الٰہی میں موجود ہے۔ یہ ان لوگوں کیلئے چراغ ہدایت ہے جو ہدایت کے خواہاں ہیں۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ سورہ بقر آیۃ (۲) یہ مجرد اخلاقیات سے اس طرح مختلف ہے کہ ان لوگوں کیلئے جو اس کا اتباع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک مذہب کا حکم رکھتا ہے، اور اس کا میدان عمل زیادہ وسیع ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان لوگوں کیلئے یہ کوئی افادیت نہیں رکھتا، جو مذہب سے جھجکتے ہیں، اس لئے کہ اس ضابطہ کا پس منظر لتناہی وسیع اور عمیق مذہبیت کیوں نہ رکھتا ہو، جب اس کو روبہ عمل لایا جاتا ہے تو عقل ہی کے راہ سے لایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ان اشخاص کیلئے بھی موضوع فکر بن سکتا ہے جو کسی ضابطہ مذہب پر ایقان تو نہیں رکھتے، لیکن فکر و عمل میں بے راہ روی کو ناپسند کرتے ہیں اور اپنے روزمرہ کاروبار کیلئے کوئی ایک معیار عمل ضروری سمجھتے ہیں۔ ان اشخاص کیلئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی انتظام النحل کا مقصد ایسے ذہن انسانی کی تعمیر ہے جو اپنے آپ کے ساتھ امن و سلامتی سے رہ سکے اور خارجی دنیا سے بھی پر امن رابطہ پیدا کر سکے۔ اگرچہ کہ اس کا مطمح نظر بلند ہو کر مقصد حیات کی تکمیل کرنا ہے۔ عمل کی یہ وسیع تر تطبیق جو مجرد عمل اخلاق یا کسی

یہ تصور توحید الٰہی اس قدر زنگ آلود ہو چکا تھا کہ وہ بالکل گم ہو جانے کے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ توحید باری کی صداقتِ جلیلہ سے ہٹ جانے کی تاریک ترین ساعتوں میں یورپ اور ہندوستان کیلئے دینِ اسلام ایک زبردست روک اور تصحیح کرنے والی قوت ثابت ہوا۔ اپنے مرکزی مقام سے ہندوستان اور یورپ کی ہر دو جانب رُخ کر کے اگر اسلام اس حقیقتِ بالغہ پر آخری مہر نہ کرتا تو خدا کی وحدانیت کا یہ تصور فکر انسانی میں وہ مستحکم مقام حاصل نہ کرتا جو آج کی عقلی اور شعوری دنیا میں اسے حاصل ہے۔"

اُس زمانے میں جبکہ آنحضرت صلعم صغر سنی سے شباب اور شباب سے بالغ نگاہی کی منزلیں طے فرما رہے تھے، اگر ہم فکر اور حیاتِ انسانی کے دریا کا تار دیکھیں تو آپکی وہ صدائے باطن جو کلمہ توحید کی صورت میں رُونما ہوئی اور حقیقتِ انسانیت کی وہ صدائے محکم معلوم ہوتی ہے جو بلند ہونے اور اپنے آپ کو منوانے کے لئے بے قرار تھی یہی وجہ تھی کہ وہ آنحضرت کی زندگی ہی میں نہ صرف حدود عرب ہی میں بلکہ اس کی سرحدوں کے پار بھی سنی گئی۔ توحید کے روحانی مضمرات کی طرف اس مقالے کے بعد کی منزلوں میں اشارہ کیا جائے گا۔ فی الحال اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی افادیت کے مدنظر یہ تصور بڑا کارگر ثابت ہوا۔ اس تصور نے کہ "خدائے تعالےٰ کے سوائے کوئی لائق پرستش نہیں ہے"، رنگ و نسل کے سارے امتیازات دھو دے، اور زندگی کے تمام امتیازی و درجہ واری سیاسی اور

فی الحقیقت اس کی ضرورت بھی ہے، کیونکہ ذہن کی قوتِ عمل کے تجزیہ کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسکی اساس کی نوعیت کیا ہے، اسکے جملہ اجزائے ترکیبی کیا ہیں، یا وہ قویٰ اور عناصر کیا ہیں، جن سے اسکی تعمیر ہوتی ہے۔ الغرض ان تمام خصوصیات کو جو اس کے لئے ایک لنگرگاہ کا کام دیتے ہیں جس سے انسان کو دور نہ ہونا چاہیئے۔

توحید باری

قرآن ذہن انسانی کو جس بنیادی تصور کی طرف متحرک کرنا چاہتا ہے وہ توحید باری کا تصور ہے۔ یہ وہ تصور ہے جسکی بنیاد پر ایک اور تصور یعنی وحدت انسانی کو قائم کرنا اور اس سے حیات کا انتساب کرنا ہے۔ "لا الہ الا اللہ"، خدا کے سوائے کوئی لائق پرستش نہیں۔ یہ وہ تصور ہے جس پر قرآن نے اتنا زور دیا ہے کہ گویا قرآن اسی ایک تصور کے مضمرات کی تشریح ہے۔ اس سے متعلق مشہور پادری سی۔ ایف اینڈرروز آنجہانی (Rev. C. F. Andrews) اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں:۔

"تاریخ انسانی کے ایک نازک دور میں اسلام نے توحید الٰہی کے تصور شدت کے ساتھ جو زور دیا، درحقیقت وہ ایک عظیم ترین نعمت تھی، جو اس نے مشرق و مغرب کو یکساں طور پر عطا کیا۔ اس عہد تاریک میں ۶۰۰ء اور ۱۱۰۰ء کے دوران، ہندو مذہب اور عیسائیت میں ان گنت دیوتاؤں اور مذہبی پیشواؤں کی پرستش کی وجہ سے

قرآنی ہدایت یہ ہے کہ :—

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۚ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ۝ سورۃ المائدہ۔ آیۃ (۳۲)

جو شخص کسی شخص کو بغیر زمین میں فساد پھیلانے کے مار ڈالے تو گویا اس نے تمام عالم انسان کو مار ڈالا اور جو شخص کو بچالے۔ اس نے گویا تمام انسانوں کو بچالیا۔

آج سے تیرہ سو سال قبل قرآن نے جس تصور پر اس قدر زور دیا تھا کہ بنی نوع انسان ایک ہی نوع تخلیق ہے، اور اختلافات نسل کا نظریہ ایک سماجی افسانہ ہے جس سے شیرازہ انسانی بکھر گیا، وہ آج کی دنیا میں ایک سائینٹیفک حقیقت کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ یونیسکو (Unesco) کی ایک مستند رپورٹ جو نسل انسانی سے متعلق ہے اور جو جولائی ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی پڑھنے کے لائق ہے۔ یونیسکو نے ماہرین سائنس کی ایک بین الاقوامی مجلس بنائی تھی تاکہ نسل کے متعلق جدید تحقیقات کیجائے، اور وہ فیصلے جمع کئے جائیں جنہیں دنیا کے ماہرین حیاتیات، نسلیات، نفسیات، سماجیات اور انسانیات نے اصولی حقائق کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ان ماہرین کے بیان کا متن اُن الفاظ سے شروع ہوتا ہے جو قرآن کے مندرجہ صدر اعلان کی یاد دلاتے ہیں۔

سائنس دانوں نے متفقہ طور پر یہ نظریہ تسلیم کرلیا ہے کہ عالم انسانی ایک وحدت ہے اور جملہ انسان ایک ہی نوع سے ہیں۔ یہ رپورٹ جس نتیجے پر پہنچی ہے وہ اُس حدیث نبوی کے اخلاقی مضمرات کی

معاشرتی تصوّرات کو مٹا دیا۔ یہ وہ نعرۂ انقلاب تھا جس میں انسانی نجات مضمر تھی۔ اس نے خدا کے بعد انسان کو سب سے بڑا درجہ دیکر اور ان کے درمیان صرف عمل صالح و تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیکر انسان میں عظمت انسانی کے احساس کو دوبارہ زندہ کیا۔

اتحاد انسانی

انسان میں عظمت انسانی کا احساس بڑھانے کے ساتھ ساتھ قرآن اسے یہ بھی سمجھنے کی ہدایت کرتا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۝ (سورۃ یونس۔ آیۃ (۲۵)) جملہ انسان پہلے ایک ہی امت تھے، اور بعد میں وہ منقسم ہوئے۔ اس لئے انسان کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اس اتحاد کو پھر سے قائم کرے۔

اتحاد انسانی کو قائم رکھنے کے مسئلہ پر قرآن اس درجہ زور دیتا ہے کہ پیغمبر خدا نے تمام بنی نوع انسان کو "عیال اللہ" سے تعبیر فرمایا ہے۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ	ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اسی سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق کو سب سے زیادہ چاہتا ہے۔
التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی عیال اللہ	سنت اللہ کی تعظیم کرو اور عیال اللہ سے محبت رکھو۔

اس وقت جو مذاہب رائج تھے، وہ عیسائیت اور یہودیت تھے۔ قرآن کا منشاء یہ تھا کہ رسول اللہ صلعم ان دونوں مذاہب کے پیرؤں سے خوش آیند راہ و رسم کی کوئی صورت نکال لیں۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ	(اے پیغمبر! ان سے) کہدیجئے کہ اے اہل کتاب!
كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ	آؤ ایک بات پر (متفق ہو جائیں) جو تمہارے
أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا	ہمارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے
نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ	سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کا کسی کو
بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن	شریک ٹھہرائیں اور نہ اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے
دُونِ اللَّهِ ۚ سورۃ آل عمران آیۃ (۶۲)	کو اپنا رب قرار دیں۔

تعاون کی شرط صرف اتنی تھی کہ توحید الٰہی پر اتفاق رہے۔ اس قسم کے تعلقات قائم رکھنے کی رعایت صرف یہود و نصاریٰ ہی تک محدود نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ دوسرے مذاہب کے پیرؤں کیلئے بھی اس میں وسعت موجود ہے بشرطیکہ توحید الٰہی کی اساسی شرط کی تکمیل ہو سکے۔ قرآن بار بار اس کا اعلان کیا ہے کہ سارے مذاہب کی اساس توحید ہے اس لئے انہیں چاہئے کہ وہ ایک دوسرے کے حریف بنکر کام نہ کریں، بلکہ عالمی اتحاد کیلئے متحد و متفق رہیں۔

رسول خدا کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ	تمہارے لئے اس نے وہی دین مقرر کیا ہے
بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ	جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس کا

وضاحت کرتی ہے کہ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ

"تم میں سے ہر ایک دوسرے کا گلہ بان ہے اور اپنے اپنے گلہ کی حفاظت کے متعلق جوابدہ ہوگا"

سائنس دانوں کی تحقیقات کا نتیجہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

"حیاتیاتی مطالعے سے عالمگیر انسانی برادری کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ انسان تعاون کے رجحانات لیکر پیدا ہوا ہے، اور جبتک یہ رجحانات پورے نہیں ہوتے، انسان اور اقوام دونوں سماجی حیثیت سے بیمار ہوجاتے ہیں۔ انسان فطرۃً مدنی الطبع پیدا ہوا ہے اور وہ اپنی منزل تکمیل تک اسی وقت پہنچ سکتا ہے جبکہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ربط کامل قائم کرے۔ کسی نقطے پر بھی اگر اس مدنی رشتے سے انکار ہو تو، اس کا نتیجہ انتشار ہوگا۔ ان معنوں میں ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالی ہے کیونکہ ہر انسان وحدتِ کامل کا ایک جزو ہے اور اصل کی ایک نوع ہے اس لئے کہ وہ انسانوں کے زمرے میں ہے"

توحید باری کی اساس پر اتحاد انسانی کا قائم ہونا معاشرتی نکتہ نظر سے قرآن کا سب سے زیادہ اہم موضوع بیان ہے۔ اس اتحاد کو قائم رکھنے کیلئے قرآن نے اولاً احساس رواداری پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ آنحضرت صلعم کے زمانے میں دیگر تنازعات کے مقابلہ میں سب سے بڑی نزاع مذہبی میدان میں تھی۔ قرآن سب سے پہلے اس نزاع کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ سامی منطقے میں

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۝ سورۃ مومنون۔ آیۃ (۵۲)

اے پیغمبرو تم سب ایک ہی جماعت ہو۔

اس قسم کی وسیع القلبی پیدا کرتے ہوئے قرآن نے ایک احتیاط یہ بھی کی ہے کہ عربوں میں یہ احساس پیدا ہونے نہ پائے کہ عربی زبان ہی جس میں قرآنی پیام نازل ہوا خاص خدا کی زبان ہے۔ خدا اپنا پیام ہر زبان میں سناتا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۝ سورہ ابراہیم آیۃ (۴)

اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی پیغمبر مگر اسکی اپنی قوم ہی کی زبان میں تاکہ وہ انہیں (پیام ربانی) وضاحت کے ساتھ بیان کرے۔

ذہن انسانی میں اس وسیع المشربی کو پیدا کرنے کا رجحان اتنا وسیع ہے کہ قرآن صرف اہل قرآن ہی کی نجات کا وعدہ نہیں کرتا بلکہ ان لوگوں سے بھی وعدہ کرتا ہے جنہیں دیگر صحائف آسمانی عطا ہوئے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ ہر اس شخص کی بھی نجات کا وعدہ کرتا ہے جو کسی خاص منضبط مذہب کا پیرو تو نہیں لیکن کسی نہ کسی طرح توحید باری کا قائل ہے اور ساتھ ہی اپنے اعمال کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا اور نیک زندگی بسر کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے (اس پر اے محمد جو ہم نے تجھ پر نازل کیا) اور وہ جو یہود و نصاریٰ اور صابئین ہیں، جو شخص اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لائے اور جو نیک کام

وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۝ سورۃ شوریٰ آیۃ (۱۳)

حکم ہم نے تم کو دیا ہے اور جسکا حکم ہم نے ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا (وہ یہ ہے) کہ تم دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ سورۃ فاطر۔ آیۃ (۲۴)

ہم نے تم کو حق و صداقت کیساتھ خوشخبری سنانے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی قوم ایسی نہیں جسمیں اللہ کی نافرمانی سے ڈرانیوالا نہ گزرا ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۝ سورۃ المؤمن آیۃ (۷۸)

ہم نے بلاشبہ کئی رسول تم سے پہلے بھیجے ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کا ہم نے تم سے ذکر کیا ہے اور بعض وہ ہیں جنکا ہم نے تم سے ذکر نہیں کیا۔

آخر میں قرآن اجمالاً یہ تلقین کرتا ہے:۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ سورہ آل عمران۔ آیۃ (۸۳)

اے مسلمانوں کہدو۔ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو کچھ ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق و یعقوب اور انکی اولاد کی طرف بھیجا گیا اور اس پر جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو انکے پروردگار کیطرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔

آیت پاک کے اس جزو پر غور کریں "ایک دوسرے کا خیال رکھیں"
"رسول اکرم کے منصوبے کے مطابق یہی وہ مقام اشتراک تھا جس پر سارے انسان جمع ہوکر عیال اللہ کی شکل اختیار کریں۔ یہی ایک طریقہ تھا جس پر انسانی برادری قائم ہوسکتی تھی۔ جس عالمی تنظیم پر رسول اکرم نے اپنا دل جمایا تھا وہ صرف پیروان قرآن ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ اس میں وہ سب داخل ہوسکتے تھے جو توحید باری پر ایمان رکھتے ہوں اور اسکے مطابق ان کا عمل بھی صالح ہو۔

آنحضرت صلعم نے اس اقل ترین شرط یعنے ایمان توحید باری جس سے عمل صالح رونما ہوتا ہے اس لئے بہت زیادہ زور دیا تھا کہ توحید الٰہی کا احساس تعلقات زندگی میں احساس وحدت انسان کا روپ اختیار کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی اصطلاح میں "کفر" کے لفظ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ غیر مسلم حلقوں میں یہ لفظ اس وجہ سے ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے مفسرین نے چونکہ اس کے حقیقی مفہوم پر زور نہیں دیا تھا بناء بریں غیر محتاط طریقے پر یہ لفظ جوش تعبیر میں نہ صرف غیر مسلموں کیلئے بلکہ ان مسلمانوں کیلئے بھی استعمال کیا جانے لگا جو کسی نہ کسی وجہ سے ایک دوسرے سے سرمو اختلاف کرتے تھے۔ اس صورت حال کا ذمہ دار قرآن تو نہیں ہے۔ دراصل کافر سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے فکر و عمل میں توحید کے مضمرات سے بے پروا ہوجاتا ہے اور اس طرح انسانوں کے درمیان نفاق پھیلانے کا موجب ہوجاتا ہے۔ یہ قرآنی مفہوم کے مطابق توحید سے عملی انکار ہے۔ اس لئے قرآن کفر سے کوئی مصالحت کرنے تیار نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ کفر یعنی ایسی قوت جو نفاق پیدا کرے، ہر اس

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ سورۃ البقرہ - آیۃ (۶۲)

کرے پس انکے لئے پروردگار کے پاس صلہ ملے گا۔ اور انکے لئے کوئی خوف اور اندیشہ نہیں اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ سورۃ الاحقاب - آیۃ (۱۲، ۱۳)

بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ یہی لوگ جنت والے ہیں یہاں وہ ہمیشہ رہینگے ان اعمال کے صلے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔

اس وسیع المشربی کا مقصد یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان کوئی آویزش نہ ہو، اور توحید باری کے ایقان مشترک کو باہمی تعلقات کی اساس قرار دیا جائے جس سے شعوری طور پر جذبۂ وحدتِ انسانی حرکت میں آئے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۝ سورۃ الحجرات۔ آیۃ (۱۳)

اے لوگو! بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قبیلے اور خاندان بنایا تاکہ تم باہم ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے وہی زیادہ شریف اور عزت والا ہے جو تم میں سے زیادہ برائیوں سے بچنے والا ہے۔

منصب انسانی

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کے پیام اولین۔ لا الٰہ الا اللہ۔ خدا کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں سے نظم تخلیق میں انسان کا مقام متعین ہوتا ہے۔ وہ انسان کا درجہ کسی دوسری مخلوق کے مقابلے میں کمتر مقام پر لا نہیں ڈالتا۔ بلکہ یزدانی اقدار کی میزان میں اس کا درجہ آفتاب، مہتاب اور دیگر اجرام فلکی سے جن کی پرستش دور سے کیجاتی ہے یا زمین کی کسی شئی سے جسکو قریب سے پوجا جاتا ہے کسی طرح کم نہیں، اور نہ فطرت کی ان غیر مرئی قوتوں کے گروہ سے جنہیں ملائکہ کہتے ہیں کسی طرح پست ہے۔

قرآن نے اعلان کیا ہے کہ انسان کی تخلیق بہترین انداز پر ہوئی ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ یہ وہ ہے جس کے آگے ملائکہ نے تعظیم سے سر جھکایا اور جس کے لئے کہا گیا کہ "مسخر کردئے ہم نے تمہارے لئے جو کچھ زمین و آسمان میں ہے"۔

اس طرح میزان تخلیق میں اس کا مرتبہ بلند کر کے اور خدا کے بعد اس کا درجہ متعین کر کے، اس کو زمین پر نائب خدا کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا جو موقع دیا گیا ہے اس سے اسکی اہمیت میں اور بھی اضافہ کیا گیا۔ اس حقیقت کا انکشاف جس تشبیہی پیرائے میں کیا گیا ہے اس سے انگریز شاعر میتھو آرنلڈ (Matthew Arnold) کے مشہور اشعار موسوم بہ انقلابات (Revolutions)

منصوبے سے جس کا مقصد اتحاد پیدا کرنا ہے، نہ میل رکھیگی اور نہ اس سے تعاون کریگی۔ اس تصوراتی اختلاف کے سوا جو کفر کی ہر شکل سے رہیگا، دیگر مذاہب کے ساتھ قرآن کا اساسی سلوک یا تو ایک خوش آئند معاملاتی سمجھوتہ کا حامل ہے جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا، یا ایک خاموش رواداری اور تحمل کا حامل ہے۔ اور یہ اس امید اور اعتبار پر اختیار کیا جائے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ ان سب کو ملا دیگا اور اس طرح منشاء توحید ایزدی اتحاد انسانی کے صورت میں پورا ہوگا۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝ سورۃ الشوریٰ۔ آیۃ (۱۵)

پس (اے محمد) انکو اسی طرف بلاتے رہو جسطرح تم کو حکم ہوا ہے اسی پر قائم رہو اور ان کے طریقوں کی اتباع نہ کرو اور کہدو کہ اللہ نے جو بھی کتاب نازل فرمائی میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمہارا رب ہے، ہم کو ہمارے اعمال کا معاوضہ ملیگا اور تم کو تمہارے اعمال کا۔ اور ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی تکرار نہ رہے۔ اللہ ہم سب کو ملائیگا اور ہم سب کو تو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

الغرض اتحاد انسانی ان اہم مقاصد میں سے ہے جسے عمل صالح کے ذریعہ انسان کو حاصل کرنا ہے ایسا عمل جو تصور توحید باری سے مطابقت رکھتا ہے اور انسان کے منصب زندگی کا تعین کرتا ہے۔

فقرے کا رہین منت ہے کہ "پہلے لفظ تھا" اور لفظ خدا کے ساتھ تھا" اور لفظ خدا تھا"
اس تصور کے تحت انسان کا مقصد یہ قرار پایا کہ اس لفظ کو دریافت کرے۔ برعکس
اس کے قرآن ایک دوسری تصویر پیش کرتا ہے۔ قرآن یہ اشارہ نہیں کرتا کہ خدا نے
حروف کا ایک انبار انسان کے ہاتھ میں اس وقت ڈالدیا جبکہ وہ عالم خاکی کی
طرف آرہا تھا، اور اسے حکم دیا کہ جو لفظ چاہے بنالے۔ اس کے برخلاف وہ یہ
اعلان کرتا ہے کہ نہ صرف وہ لفظ انسان کو بتادیا گیا اور اس کا مفہوم اسے سمجھادیا
گیا بلکہ اس خیال سے کہ کہیں وہ اسے بھول نہ جائے اسکے اجزائے ترکیبی بھی اسکے خمیر اور
ضمیر سے پیوست کردئے گئے اور اسے حکم دیا گیا کہ اس امانت کی حفاظت کرے،
اسکے حروف سے نہ کھیلے، اسکی ترتیب کو ہاتھ نہ لگائے، تاکہ ایک طرف وہ اپنے نفس کیساتھ
امن وسلامتی سے رہ سکے اور دوسری طرف خارجی دنیا کیساتھ بھی امن وسلامتی سے زندگی بسر کرسکے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ
جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا
اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا
وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ
اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝
وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا
ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ

اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں
عنقریب اپنا نائب (خلیفہ) بھیجنے والا ہوں تو
انہوں نے کہا کہ کیا تو اس (زمین) پر ایسے کو نائب
بنانا چاہتا ہے جو اسمیں فساد اور خونریزی برپا
کریگا درآنحالیکہ ہم تیری تعریف کیساتھ تسبیح و
تقدیس کرتے رہتے ہیں۔ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے)
بیشک میں جانتا ہوں ان باتوں کو جنکو تم نہیں
جانتے۔ اور اس نے (اللہ تعالیٰ نے) آدم کو

کی یاد آتی ہے۔

"اس سے قبل کہ انسان عالم خاکی کیطرف روانہ ہوا، اور جبکہ وہ ہنوز سرحد آسمانی پر کھڑا ہوا تھا خدا نے اس کے ہاتھوں میں حروف کا ایک انبار ڈالدیا اور حکم دیا کہ اس سے جو لفظ چاہے بنالے۔

انسان نے اسے کئی مرتبہ الٹا، پلٹا۔ بنایا یونان، روما، انگلستان، فرانس۔ ہاں یہ کوشش رائیگاں نہ ہوئی۔ نئی نئی راہیں نکل آئیں۔ تجربے ہوتے رہے۔ حروف ملتے رہے، کچھ نہ کچھ بنتا رہا۔

مگر شاعر اپنی درد بھری آواز میں کہتا ہے کہ:۔

آہ! ایک فروتر ہونے والا احساس اسے ستا رہا ہے کہ وہ جو (لفظ) بنانا تھا نہ بنا سکا۔ اگرچہ کہ وہ بوڑھا ہو چکا اس کی یہ تمنا ہے کہ از سر نو کوشش کرے، اسلئے کہ اسے اس لفظ کا پتہ نہیں لگا جسے خدا چاہتا تھا۔

اپنے عہدِ عروج کو پہنچ کر سلطنتوں کی سلطنتیں اسی احساس گراں کو محسوس کرتی رہیں، یہ محسوس کیا کہ ان کے عظیم ڈھانچے صحیح تعمیر نہ ہو سکے، اس لئے وہ زوال پذیر ہوئے اور اپنے ہی تخت پر سسکتے سسکتے ختم ہو گئے۔

یہ تھا شاعر کا خیال جو بدیہی طور پر سینٹ جان St. John کے اس

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ تو انہوں نے جواب دیا کیوں نہیں ہم سب اس کے
شَهِدْنَا ۚ سورۃ الاعراف آیت (۱۷۲) گواہ ہیں۔

اس طرح لبیں ہو کر فطرت انسانی نے بار امانت یعنی بار خلافت اُٹھانے کیلئے خود کو آمادہ پایا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۝

بیشک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا لیکن ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

سورۃ الاحزاب۔ آیۃ (۷۲)

(بار امانت اُٹھانے کا) یہ عمل بہ ظاہر کوئی آسان کام نہ تھا۔ خود قرآن بھی اس جرأت رندانہ پر متحیر ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے سلسلے ہی میں ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ بیشک وہ (انسان) اپنے اوپر بڑی سختی کرنیوالا اور کسقدر سادہ لوح ہے۔

لیکن منشاء بھی تھا کہ وہ اس بارِ امانت کو اٹھائے تاکہ اسی کی تکمیل کیلئے اس کو ایک حالت سے دوسری بہتر حالت کی طرف لیجائے۔

یہ طریقۂ عمل الٰہی نظام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ارتقائے تخلیق سے متعلق ہے اور جس پر آئندہ چل کر ہم تفصیلی روشنی ڈالینگے لیکن اس آزمائش میں جو صعوبت ہے اسے ہلکا کرنے، اور بارِ امانت اُٹھانے میں اس کی

فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

سورۃ البقرہ - آیۃ (۲۸ تا ۳۱)

سارے (چیزوں کے) نام سکھائے اور پھر انکو فرشتوں کے سامنے رکھا اور فرمایا کہ اگر تمہارا کہنا صحیح ہے تو مجھے انکے نام بتاؤ۔ انہوں نے (فرشتوں نے) کہا کہ تو پاک اور برتر ہے ہمکو جو کچھ تو نے سکھلایا ہے اسکے سوا ہمیں کسی اور چیز کا علم نہیں بیشک تو بڑا ہی جاننے والا ہے اور حکمت والا ہے۔ (تب) اس نے (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ آدم تم انکو ان چیزوں کے نام بتاؤ اور جب انہوں نے انکو (فرشتوں کو) انکے نام بتلائے تو فرمایا (اللہ تعالیٰ) کیوں! کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں جنکو تم نہیں جانتے۔

اس طرح جب اس میں منشاء تخلیق اور اسماء یعنی اشیاء کا مفہوم یا قوانین حیات کا شعور پیدا ہوا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انسان وحدت حیات کی توثیق کردے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

اور جب تمہارے رب نے اولاد آدم کی پشت سے انکی اولاد نکالی اور ان سے خود انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

مفہوم کی وضاحت کے سلسلہ میں خود قرآن کہتا ہے کہ

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ۝ پھر ہم نے کر دیا نیچے والوں سے بھی نیچے بجز ان کے
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے
الصّٰلِحٰتِ ۝ (سورۃ والتین - آیۃ ۵ و ۶)

بعض لوگ ایمان و اعتقاد کو نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بتاتے ہیں، لیکن اسلام میں اعتقاد محض کافی نہیں اس کے مناسب عمل صالح بھی ضروری ہے اسکی اچھائیوں اور نیکیوں کے برقرار رکھنے، اور زمین پر نائب خدا کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں اسکی دستگیری کرنے کا یہی اسلوب ہے۔ یہ نیابت کلیسا کی یا بادشاہوں کا وہ "ظل الٰہی" اقتدار نہیں ہے۔ جس سے بندگانِ خدا پر من مانے حکومت کیجائے۔ اس کی بجائے یہ خود بنی نوع انسانی کا جبلی حق ہے کہ وہ اپنی زندگی کو تنظیم اور ہم آہنگی کے اس اصول کے مطابق منضبط کرے جو تخلیق یزدانی میں نظر آتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ سیدھے اس دین یا
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ راستہ کی طرف رکھو جو اللہ ہی کا راستہ ہے اور
عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ جس پر انسان کو فطرتاً ڈھالا گیا ہے۔ اللہ کے
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ راستہ میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی سیدھا
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

سورۃ الروم - آیۃ (۳۰)

وہی لوگ صحیح معنوں میں زمین پر خدا کے نائب کہلائے جا سکتے ہیں جو خدا کی

مدد کرنے، یا اسے دی جانیوالی زندگی کی حفاظت کرنے، یا اسے بتائے ہوئے اسم یا لفظ کے حروف کو مرتب رکھنے کیلئے، اس کی فطرت میں ایک توازن کا احساس پیدا کر دیا گیا، اور اس سے یہ کہا گیا کہ جس طریقے سے وہ اس سے کام لیگا اسی انداز سے وہ اس کا صلہ پائیگا۔ اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ۝

سورۃ الشوریٰ - آیۃ (۱۷) "اللہ ہی تو ہے جس نے کتاب اتاری حق اور میزان کے ساتھ"

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝	قسم ہے جان کی اور اسکی جس نے اسکو درست
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝	اور ٹھیک بنایا اور پھر اسکو برائی اور پرہیزگاری
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝	میں تمیز کرنے کی صلاحیت بخشی پس کامران ہے
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝	وہ جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا۔ اور ناکام ہے وہ
سورۃ والشمس - آیۃ ۷ تا ۱۰)	جس نے اس کو گندہ کر دیا۔

اسی آیت میں جو حقیقت رکھی گئی ہے اسے قرآن نے ذو معنی طریقے پر بیان کیا ہے جو دونوں طرح بھی صحیح ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ	بیشک ہم نے انسان کو بہترین انداز میں پیدا
اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ	کیا اور پھر پھیر دیا ہم نے اسکو نیچے والوں سے
اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ سورۃ والتین۔	بھی نیچے۔

آیۃ (۴ و ۵)

فطرت انسانی کے اس تضاد کو ہر عہد کے ہر مفکر کو تسلیم کرنا پڑا۔ ہر مذہب کا یہ کام ہے کہ وہ انسان کو سطح حیات سے نیچے اترنے سے روکے۔ اس ذو معنی

ہے جتنا کہ توحید الٰہی کا وہ تصوّر جو عمل صالح کے نظام العمل کے ذریعہ وحدتِ انسانی کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

بنائی ہوئی راہ پر سر جھکاتے اور پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا فریضۂ حیات نہ صرف اپنے، بلکہ تمام ہم جنسوں کے ساتھ بھلائی کرنا ہے جو نبی کریم صلعم کے الفاظ میں باہم مل جل کر "عیال اللہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جن میں کا ہر فرد اپنی زندگی اپنے خالق سے حاصل کرتا ہے اور جس کی ہی طرف وہ لوٹینگے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَٰٓئِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُم مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَٰبِ مِن شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝ سورۃ انعام آیۃ (۳۸)

نہیں ہے زمین پر چلنے والا کوئی ایسا جانور اور نہیں ہے اپنے دو بازوؤں پر اڑنے والا کوئی ایسا پرند، مگر یہ کہ انکی بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ ہم نے کتاب میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا ہے۔ پھر سب اپنے رب کی طرف جمع کئے جائینگے۔

آخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نائب خدا کی حیثیت سے انسان کا منصب حیات صرف یہی نہیں ہوگا کہ وہ اپنے آپ کے ساتھ امن و سلامتی سے رہے اور خارجی دنیا کے ساتھ رابطہ امن قائم رکھے، بلکہ اپنی زندگی کو اس طرح سنوارے کہ اس سے حیاتِ مابعد کی مقتضیات بھی کما حقہٗ پوری ہو سکیں۔ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ۔ یہ وہ صورت ہے جو قرآن ہر ایک کے سامنے لاتا ہے۔ اور یاد دلاتا ہے کہ ہر مرد اور عورت کو اپنے اپنے اعمال کا حساب جو انہوں نے اپنی موجودہ زندگی میں کئے ہیں خدا ہی کے آگے دینا ہوگا۔ اس لئے إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ کا نظریہ انسان کے لئے اتنی ہی اہمیت رکھتا

ہمارے لئے بھی یہ لفظ زندگی کے دو عظیم اور ناقابل تقسیم پہلوؤں کو پیش کرتا ہے، ایک عبادت، دوسرے عمل۔ "عبادت کرو، اور خیرات کرو"، آنحضرت صلعم فرماتے تھے:۔ ان کے عہد کی سادہ ضروریات کے مدِّنظر خیرات کا مفہوم جو قابل تحسین دانشمندی کے ساتھ قائم ہوا، اپنے معنوں میں اس قدر وسیع ہے کہ ہر قسم کے خیر اور نیکی کے میدان پر حاوی ہے۔ قرون وسطیٰ کی اس بزرگ ہستی نے کہا تھا۔ "عبادت کرو کہ جیسے عمل سے کچھ حاصل نہیں۔ اور عمل اس طرح کرو کہ جیسے عبادت کا ماحاصل کچھ بھی نہیں۔ ہر عہد اور ہر قوم کے روحانی پیشواؤں نے یہی بات مختلف طریقوں اور زبان اور تمثیلی اشاروں میں کی تھی۔ میں نے اسے کنفیوشیس (Confucius) کی تعلیم میں دیکھا جو ایسے مذہب کا بانی ہے جس پر چینی قوم ۲۵ صدیوں سے متحد ہے۔ یہی ہندوستان کی قدیم تعلیمات میں پاتا ہوں۔ جیسے جیسے علم جدید کو ان کے اسرار کا انکشاف ہو رہا ہے مصری قدیم یادگاروں میں بھی یہ موجود ہے۔ میں اسے حکیم فیثا غورث (Pythagoras) کی مساعی میں بھی پاتا ہوں جس نے ناپختہ کار ہی سہی لیکن انسانی اساس پر حیات کو منظم کرنے میں نہایت بار آور نتائج پیدا کئے۔ آخر میں میں اسے عبرانی اور عیسائی انجیلوں میں بھی دیکھتا ہوں۔ جن کا ادعا یہ ہے کہ ایسی تعلیم صرف انہیں کا

باب سوم

تیاری

یہ کام کس طرح انجام دیا جائے؟ اس کا جواب ایک لفظ "اسلام" یا سنت اللہ کی پابندی میں مضمر ہے۔ جس کے لئے قرآن کے بیان کے مطابق انسان فطرتاً خلق کیا گیا ہے۔

اس اصطلاح کی تشریح جس کی ادعا جملہ مذاہب عالم میں موجود ہے۔ ڈاکٹر جی، ایچ، برجس نے (Dr. J. H. Bridges) جو ایک ایجابی مفکر اور کانٹ (Cante) کے پیرو ہیں اپنی اس تقریر میں کی ہے جو ۱۸۷۹ء میں کی گئی تھی۔

"مسلمان کا ایمان صرف ایک لفظ "اسلام" یعنی اطاعت، یا اپنی مرضی کو خدا کے فیصلہ عظیم کے سپرد کر دینے میں مضمر ہے۔ یہ لفظ محمد صلعم نے صرف اپنے متبعین کی حد تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ بلا تعصب اپنے پیشرو یہود و نصاریٰ کیلئے بھی استعمال کیا۔ بنی نوع انسان کے مذہب کیلئے اس سے زیادہ مناسب کوئی دوسرا لفظ موجود نہیں ہے یورپی زبانوں میں اگر کوئی لفظ اس کا صحیح مفہوم ادا کر سکتا ہے تو وہ خود لفظ "ریلجن" (Religion) ہے۔ اُن کانوں کیلئے جنکی تربیت لاطینی بولی کے لئے نہیں ہوئی ہے، اسکی تشریح ضروری ہے۔ پیروانِ اسلام کیلئے

اگر وہ انسان کے لئے ایک متحرک اخلاقی زندگی حاصل نہ کرے۔ پھر یہ متحرک اخلاقیت اس شخص کے لئے بھی ناممکن ہے جو کسی خانقاہ یا غار میں گوشہ نشین ہو کر اپنی انفرادی نجات کا خواہاں ہے، یا جو جسمانی ضروریات کو نظر انداز کر کے یہ سمجھتا ہے کہ اس کا فرض اپنی روح کی پرورش ہے۔ ایسے اشخاص کے لئے نیابت الٰہی کسی حال میں بھی ممکن نہیں۔ اس کے بجائے یہ اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے اندر یزدانی صفات پیدا کرتا ہے اور ارادت کے ساتھ ایک ہم آہنگ پیرائے میں اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی فلاح کے لئے ان کو بروئے عمل لاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء کی طرح اس کے صفات بھی متعدد ہیں۔ ان کا شمار نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قدرت خداوندی کا کماحقہٗ احصاء بشر سے ممکن نہیں کیونکہ وہ اپنی بشریت میں محصور ہے۔ قرآن کے الفاظ میں "تمام اچھے نام اللہ ہی کیلئے ہیں"۔ کیونکہ کمال اللہ ہی کی خصوصیت ہے۔ انسان کو چاہئے کہ ان صفات کی اہمیت کو جنکی قرآن میں بطور خاص یاددہانی کی گئی ہے، انسانی زندگی میں حتی الامکان سمجھنے کی کوشش کرے۔ ان میں سے بعض ایسی صفات ہیں جو روحانیت یا تصوف کے خاص دائرے میں داخل ہیں لیکن ان میں اکثر و بیشتر صفات جو اس کے علم، قدرت، انصاف، رحم اور رحمانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، بآسانی اجتماعی عمرانیاتی مطالعہ کا موضوع بن سکتی ہیں۔ خود ان صفات کی شاندار فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ جو ذات باری تعالیٰ کو کسی ایک صفت میں محصور کرنے یا اسے اوتار بنانے کی نامعقولیت کو کھول کر رکھ دیتی ہے۔ اسلام میں ذاتِ باری

اجادہ ہے۔

اس طرح اسلام یا انگریزی زبان میں "اطاعت"، یعنی زندگی کو رفیع ترین مقاصد کے سپرد کر دینا، اپنے ارادے کو مشیت ایزدی کے مطابق بنا دینا۔ یہ وہ لفظ ہے جو ہر عہد اور ہر ملک کے نیک انسانوں کی زندگی کا اجمال ہے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک نصب العین، ایک مثال، ایک نقشہ بنا لیا اور تا حدِ امکان یہ کوشش کی کہ یہ نصب العین ایک حقیقت بن جائے۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے عبادت بھی کی اور عمل بھی کیا۔"[1]

اب سوال یہ ہے کہ اپنی مرضی کو قادرِ مطلق کی مرضی کے مطابق کس طرح بنایا جائے؟ اس کام کے لئے دو پہلو ہیں۔ اولاً ایمان و ایقان۔ ثانیاً اس کے مطابق عمل۔ "عبادت کرو اور کام کرو" صرف یہی انسان کا وظیفہ حیات نہیں ہے بلکہ قرآنی حکم یہ ہے کہ:۔ "ایمان لاؤ اور عمل صالح کرو"۔ اسلام میں "عبادت" زیادہ تر روح کا ایک عمل ہے اور "عمل" کا لفظ اس پر حاوی ہے۔ قرآن اس امر پر زور دیتا ہے کہ ایقان محض کافی نہیں اور یقیناً مناسب عمل کے بغیر ایقان محض ایک جمودی کیفیت ہے۔ ذات باری کا فلسفیانہ ادراک یا مراقبہ بے نتیجہ ہے اگر وہ صفات الٰہی کے مطابق زندگی میں حرکت عمل پیدا نہ کریں۔ اسی طرح وہ روحانی مشق جو بعض حلقوں میں بطور وظیفہ کیجاتی ہے، یا روحانی کمالات کا عمل خواہ وہ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، ایک نفسیاتی ورزش سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں رکھتا

هُوَ حَسِيرٌ ۔ سورۃ الملک ۔ تیری نظر ناکام (عاجز) اور درماندہ ہوکر
آیۃ (۳ و ۴) تیری ہی طرف لوٹ آئیگی۔

جو انسان زندگی کے زینہ پر چڑھ کر زمین پر نائب خدا کی حیثیت سے کام کرنا چاہتا ہے تو اس کا فریضہ یہی نہیں ہے کہ صرف اپنی ہی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ خارجی دنیا سے بھی اسی طرح ہم آہنگی پیدا کرے۔ "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا حکم حیات انسانی کے مختلف منازل کے لئے مختلف مفہوم رکھتا ہے تاکہ انسان درجہ بدرجہ اپنے آپ کو عمل کے رفیع سے رفیع تر فرائض انجام دینے کے قابل بنا سکے۔ قرآنی ہدایات کی روشنی میں جو لوگ یہ عظیم سفر حیات طے کرنے کا اقدام کرتے ہیں ان کا شمار ایک ہی زمرہ میں نہیں کیا جاتا۔ قرآن مجید صراط الٰہی پر چلنے والوں کی، جس اعتبار سے کہ وہ الٰہی صفات کا مظاہرہ کرتے ہیں مختلف انواع قرار دیتا ہے۔ اور ہر ایک کو ایک خاص لقب سے یاد کرتا ہے۔ یہ لوگ صرف قوت ایقان سے نہیں بلکہ اپنے اعمال کی بناء پر اس طرح ملقب کئے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر اس شخص کا جو اسلام پر ایمان رکھتا ہے "مومنین" کے زمرہ میں شمار نہیں ہوسکتا جبتک کہ اس کے ایمان کی توثیق اس کے عمل سے موثق نہ ہو۔ یہ انواع مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔ صالحین، متقین، مصلحین، مقسطین، صابرین، شاکرین، محسنین، صادقین، صدیقین، شہداء، اولیاء، مسلمین، مقربین، اولوالعلم، اولوالالباب، وغیرہ، لیکن یہ بات یاد رہے کہ ان سب کا ایک مشترک

ہر قسم کی صفات سے، اعلیٰ و ارفع ہے اور اس کی ہر ایک صفت دوسری تمام صفات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ہی معرض شہود میں آتی ہے۔ انسان کا منصب یہ ہے کہ جہاں تک اس کی فطرت اس کا ساتھ دے سکے، وہ باری تعالیٰ کی صفات کو اپنے نفس میں تخلیق دے۔

قرآن کی صلائے پیہم یہ ہے کہ انسان خارجی عالم کی تخلیقات اور ان کے قوانین عمل کا مطالعہ کرے۔ وہ اشارہ کرتا ہے کہ ان سب میں ہم آہنگی اور توازن کا ایک قانون ازلی جاری و ساری ہے تاکہ انسان محویت کے ساتھ ان کا اتباع کرے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝
وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝
وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ
الْمِيْزَانَ ۝ سورۃ الرحمٰن۔ آیۃ (۵ تا ۷)

سورج اور چاند ایک نظام کے پابند ہیں اور ستارے اور درخت اطاعت کر رہے ہیں اور اسی نے آسمانوں کو بلند کیا اور توازن قائم کیا۔

اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ
طِبَاقًا مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ
مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ
هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ
ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ
اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ

(بڑا ہی بزرگ اور عالی شان والا ہے وہ) جس نے ساتوں آسمانوں کو اوپر تلے کیا۔ تو خدائے مہربان کی اس تخلیق و صنعت میں کوئی خلل یا نقص دیکھا؟ پھر نظر اٹھا کر دیکھ! کیا تجھے اسمیں کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ مکرر دیکھ اور بار بار نظر ڈال کر دیکھ

فرض ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے :۔

تعلموا العلم فان تعلمه معالم الحلال والحرام ومنار سبل اهل الجنة وهو الانس فی الوحشة والصاحب فی الغربة والدليل على السراء والضراء والسلاح على الاعداء والزين عند الاخلاء يرفع الله به اقواماً فيجعلهم فی الخير تارة دائمة تقتص اثارهم ويقتدى بفعالهم وينتهى الى رائيهم ۔

علم حاصل کرو اس سے حق و باطل میں امتیاز کرنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جنت کی طرف راستہ کھولتا ہے۔ جو کوئی دوست نہ ہو تو یہ اپنا رفیق ہے۔ یہ مسرت کی رہبری کرتا ہے اور مفلسی میں رفاقت کرتا ہے۔ یہ دشمنوں کے خلاف ایک حربہ اور دوستوں کے لئے ایک زیور ہے۔ اسکی برکت سے اللہ تعالیٰ قوموں کے مدارج بڑھاتا ہے اور اچھے اعمال کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ اور انہیں امامت عطا کرتا ہے اس حد تک کہ ان کی پیروی کیجاتی ہے ان کے اعمال کی تقلید ہوتی ہے اور ان کی رائے فیصلہ کن ہوتی ہے۔

جو اولو العلم ہیں وہ فطرتاً ہماری اولین توجہ کے قابل ہیں کیونکہ علم وہ ذریعہ ہے جس سے ان صفات کی تربیت ہوتی ہے جو دوسری انواع کیلئے مخصوص ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ

اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور اسطرح گواہی دی فرشتوں نے بھی اور

مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اشیاء کے یزدانی نظام میں جو توازن اور ہم آہنگی موجود ہے وہی لازماً ان کی زندگی میں بھی ظاہر ہو۔

قرآن کی ان پسندیدہ ہستیوں کے برخلاف چند ہستیاں ایسی بھی ہیں جنہیں قرآن واضح طور پر ناپسندیدہ نظر سے دیکھا ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو اس "توازن و ہم آہنگی" میں خلل ڈالتے ہیں جس کا قیام زندگی میں ضروری ہے، یا "زمین پر فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں"۔ ان کی تقسیم بھی نوعیت شر کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ انہیں کافرین، مشرکین، ظالمین، مفسدین، غافلین، منافقین، وغیرہ سے موسوم کیا گیا ہے۔

قرآن جن کو پسند کرتا ہے انکی امتیازی تقسیم صرف اس بنیاد پر کی گئی ہے کہ دوسروں کے بہ نسبت ان میں کوئی ایک صفت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جتنی زیادہ صفات کسی انسان میں پائی جائینگی اس کا مقام حیات اتنا ہی رفیع ہوگا اور وہ یقیناً آیات الٰہی کے لئے زیادہ موزوں سمجھا جائیگا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ	اور وہ وہی ہے جس نے تم کو زمین پر اپنا نائب
الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ	بنایا اور تم میں سے بعض کے مرتبہ کو دوسروں
بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ	کے مرتبہ سے بلند کیا تاکہ وہ تمہاری ان چیزوں
فِي مَا آتَاكُمْ (سورۃ الانعام آیۃ ۱۶۵)	میں آزمائش کرے جو اس نے تمہیں دی ہے۔

ان تمام صفات میں جو منصب حیات کو پورا کرنے کیلئے انسان کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہییں علم کا درجہ اشرف و افضل ہے۔ اسکی تحصیل ہر مرد اور عورت پر

اس کی معرفت حاصل کی جائے، ایسا عرفان جس کے ذریعہ حقائق اشیاء کی ہم آہنگی کا بخوبی ادراک ہو سکے۔ اس لئے کتاب مقدس میں تحصیل علم کیلئے فکر لازمی قرار پائی ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ	ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ انکے
الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝	درمیان ہے انکو محض کھیل کی خاطر نہیں
مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ	پیدا کیا ہے۔ ہم نے انکو اپنی اپنی جگہ بہت
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝	ہی ٹھیک یا مناسب انداز میں پیدا کیا۔
سورۃ الدخان۔ آیۃ (۳۸ و ۳۹)	لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت) کو نہیں جانتے۔

"لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے" یہ وہ المناک اشارہ ہے جو قرآن مجید میں ہر موڑ پر ملتا ہے۔ جہاں کہیں مظاہر حیات پر غور اور تجسس کے ساتھ توجہ کرنیکی ہدایت کی گئی ہے وہاں "وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ یا لَا يَفْقَهُوْنَ" جیسے اشاروں کی گونج اور ارتعاشات بار بار سنائی دیتے ہیں۔ ان اشاروں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کی نظر میں عرفان و بصیرت حاصل کرنے کیلئے فکر کی کتنی اہمیت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مخصوص دعا یہ تھی:۔ "اے خدا تو مجھے اشیاء کا ایسا علم دے جیسی کہ وہ ہیں" اس علم کے حاصل کرنے کا جادہ اولین فکر ہے۔

قرآنی تصور کے اعتبار سے علم ہر شعبۂ حیات پر محیط ہے، خواہ کائنات عظیم کی حیات ہو جو انسان کے ارد گرد، قریب یا بعید ربط کے ساتھ روبعمل ہے، یا خود حیات انسانی جو اپنے ماضی کے آغوش میں مستقبل کی طرف روبہ حرکت ہے۔

قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۝ سورۃ آل عمران۔ آیۃ (۱۶) اسی طرح اہل علم نے بھی جو توازن قائم رکھتے ہیں۔

یہ ہے علم کا وہ مرتبہ جو قرآن متعین کرتا ہے مثلاً تو ابین کی صفت (یعنی ان لوگوں کی جو غیر مسطح راستے کو ہموار کرتے ہیں) یا صالحین کی صفت (جو صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں) یا مصلحین (جو زندگی کو درست کرتے ہیں) یا محسنین کی (جو عمل صالح اس نہج سے انجام دیتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اسکی توفیق ہو تاکہ وہ اسی طرح دوسروں کی غلطیاں درست کر سکیں اور نیک اعمال کریں) یا مقسطین کی (جو دوسروں کے حق کا اعتراف کرتے، معدلت گستری کرتے اور ان اصحاب کو جو نیک اعمال کرنا چاہتے ہیں نہ صرف اس کا موقع دیتے ہیں بلکہ صالح عمل میں ان کی مدد بھی کرتے ہیں) یا صدیقین کی (جو تکتہ سنجی کے ساتھ حق اور سچائی کا ساتھ دیتے ہیں) یا مسلمین کی (جو خدا کی راہ میں کامل تسلیم و رضا اختیار کرتے ہیں)۔

یہ اور اسی قسم کی دیگر صفات امتیازی اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہیں جسے نعمت علم حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرد اور عورت پر تحصیل علم واجب کر دیا ہے اگرچہ کہ اس کے لئے ملک چین کیوں نہ جانا پڑے جو اس وقت کی دنیا کی بعید ترین سرحد سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ایک چیز جس کی صاف طور پر قرآن نے وضاحت کر دی ہے کہ علم کا مطلب یہ نہیں کہ کسی ایک موضوع پر دماغ میں کچھ خیالات یا مواد کو جمع کر لیا جائے۔ اسے تحصیل علم نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ اشیاء میں جو فطری ربط ہے

سے کہا تھا "دیکھا تم نے! ایسی تعلیم کبھی ناکام نہیں ہوتی! ہم اپنے سارے نظامات کے باوجود اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور عام طور سے کوئی انسان بھی آگے نہیں جا سکتا۔" اسلام کا مسئلہ دراصل دو قوتوں، مذہب اور تہذیب کے باہمی تصادم اور ساتھ ہی ساتھ جذب باہمی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابتداءً عیسائیت کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا۔ عیسائیت کا سب سے اہم نکتہ حیات روحانی کیلئے ایک آزاد مواد کی تلاش ہے جس کو بانیٔ عیسائیت کی عمیق النظری کے مطابق ان قوتوں کے ذریعہ نہیں جو روح انسانی سے خارجی دنیا سے متعلق ہیں، بلکہ اس نئے عالم کے انکشاف سے جو اسکے اندر ہے، ترقی پذیر اور رفیع تر کیا جا سکتا ہو۔ اسلام اس عمیق النظری سے پوری طرح متفق ہے لیکن وہ اس کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ اس طرح منکشف شدہ نئی دنیا کی تجلی ساری دنیا سے کوئی ہٹی ہوئی شئی نہیں ہے، بلکہ اس کے بطون میں نفوذ کئے ہوئے اور جاری وساری ہے۔"

قرآن اس امر کی پوری اجازت دیتا ہے کہ انسان اپنے اندر اور خارجی دنیا میں کارفرما قوتوں کو ان کے مناسب مطالعے کے ذریعہ مسخر کرے لیکن وہ ایک شرط پیش کرتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان کو یہ تلقین کرتا ہے کہ اسکی فطرت میں جو میزان رکھی گئی ہے اس کو وہ اپنے ذہن میں ضبط رکھے، اور اپنے علم کے ذریعہ جو قوت اسے حاصل ہوتی ہے۔ اسے اپنی زندگی میں ان خدائی صفات کے

تحصیل علم میں انسان کو نہ صرف اپنے ذہنی اور جسمانی قویٰ بلکہ اپنے روحانی جوہر کو کام میں لانا ہوتا ہے اور اسلام میں اس کے لئے کسی امر کی ممانعت نہیں ہے سوائے شاید اُس سعیٔ لاحاصل کے جو اس نقاب کے اُٹھانے میں صرف ہو جس تک اسکی عقل اور قوت وجدان کی رسائی ممکن نہیں، یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں قرآنی تہذیب اور قدیم یونانی تہذیب میں جس پر آج کل کی یورپی تہذیب قائم ہے اساسی فرق نظر آتا ہے۔ جہاں یونانی طرزِ فکر نے صرف بنی نوع انسان یا انسان بہ حیثیت انسان کے مطالعے پر اپنی توجہ مرکوز کی وہاں قرآنی ذہن ساری کائنات کو بہ یک نظر دیکھ لیتا ہے ـــــ نہ صرف انسان کی مادی دنیا، بلکہ اسکی روحانی دنیا، سیارے، چرند پرند، مور و ملخ، اور ستاروں کی دنیا، مظاہر اور اعیان کی دنیا، سب پر اسکی نظر وقت واحد میں دوڑ جاتی ہے اس لئے کہ یہ سب اس کے شعور میں رشتہ بہ رشتہ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ وہ ہر شئی کی تخلیق کے رازِ دروں پر غور کرتا، اسے سمجھتا اور ان سب کے باہمی رشتہ کے اُس عظیم روحانی قانون کا ادراک کرتا ہے جس سے وہ اس حیات متحدہ کے قالب میں خوبی کے ساتھ بیٹھ سکیں۔ سر محمد اقبال لکھتے ہیں:۔

"قرآن کا مقصد حقیقی یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر خدا اور کائنات کے ساتھ اسکے ربط گوناگوں کا اعلیٰ شعور پیدا کرے۔ قرآنی تعلیم کے اسی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے گوئٹے Goethe نے اسلام کی تعلیمی قوت پر ایک عام تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمن (Eckerman)

پائی جاتی ہے جو روحانیت کی طرف مائل رہتے ہیں۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۝ سورۃ البقر۔ آیۃ (۶۰)	اور تمہارے رب نے کہا کہ مجھے پکارو میں تمہیں جواب دونگا۔
وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي ۝ سورۃ البقر۔ آیۃ (۱۸۶)	اور (اے پیغمبر) جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو (کہدو کہ) میں انکے نزدیک ہوں اور پکارنے والے کی پکار کا جبکہ وہ مجھے پکارتا ہے جواب دیتا ہوں۔

یہ ایک شعوری کوشش ہے۔ جواب فوراً ملتا ہے۔ عمل اور ردعمل شانہ بشانہ رونما ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اسکی صفات کے توسط سے یاد کرو اور وہ صفات تمہارے اندر نفوذ کرکے تمہاری ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اللہ کو اسکی صفاتِ کاملہ اور اسکی ذات کے توسط سے جو ان صفات کو ایک وحدتِ کاملہ میں سمیٹی ہوئی ہے، یاد کرو اور تمہیں وہ جوہر ذاتی چھو لیتا ہے اور تمہارے اندر جاری و ساری ہو جاتا ہے۔ اس حالت کا نام "قربِ الٰہی" ہے۔ یہ تجربہ حقیقتِ کامل کی تلاش کا نام ہے اور ایک طرف وہ ایک قسم کی عبادت ہے تو دوسری طرف دیگر انسانی تجربوں کی طرح یہ ایک میزانِ ادراک و شعبۂ علم ہے۔ اس علم کا ذریعہ انسانی ذہن نہیں ہے بلکہ وہ ہے جسے قرآن "قلب" کہتا ہے۔

حقیقت کی صوفیانہ تلاش کے متعلق لکھتے ہوئے مولانا رومؒ فرماتے ہیں:-

"صوفی کی کتاب روشنائی اور حروف سے نہیں بنتی ہے، وہ برف

ذریعہ جلوہ نما کرے۔ جسکی بدولت وہ "خدا کے خاندان سے" محبت کر سکے۔ اور جس کے لئے وہ درحقیقت بدیں غرض خلق کیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا رکھوالا بن کر نیابت الٰہی کے فرائض انجام دے سکے۔ اگر ہم اس پیرائے میں بیان کر سکتے ہیں تو کہیں گے کہ فطرت کی اس غیر متشخص پنہاں قوت کو جسے سائنس بروئے کار لاتی ہے ایک شخصیت دی جائے، اور اس میں دوسری مخلوق کی طرح اُس میزان کا شعور پیدا کیا جائے جو اُس میں ودیعت کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس قوت میں انسانیت پیدا کیجائے اور بقول قرآن "اللہ کی روح اس میں پھونکی جائے"۔ انسانی عمل کا یہی اولین منصب ہے۔ اور اگر "اٰمنوا وعملوا الصالحات" کے مفہوم و مضمرات کا صحیح احساس حاصل کرنا ہے تو اِس حقیقی منصب عمل کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ اپنی خودی اور خارجی دنیا سے اپنے روابط کا ادراک و شعور جس حد تک عمیق و شدید ہوگا اسی حد تک صالحین، متقین، صدیقین، مُقربین، وغیرہ، بننے کا موقع حاصل ہوگا۔ جس سے کسی نہ کسی حیثیت میں نیابت الٰہی کا منصب پائے تکمیل کو پہنچتا ہے۔

آخر الذکر قسم جسے مقربین کہتے ہیں۔ یعنی وہ جنہیں خدائے تعالیٰ اپنے قریب کر لیتا ہے ان افراد کی ہے جو الفاظ نبوی میں اشیاء کی معرفت کا جیسا کہ وہ ہیں۔ علم رکھتے ہیں۔ اس حقیقت یا سرچشمۂ حیات کا علم صوفیوں کی اصطلاح کے مطابق "قرب الٰہی" سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ تجربہ ایک اکتسابی صلاحیت ہے جو بہ نسبت ان لوگوں کے جو دنیوی امور میں اُلجھے ہوئے ہیں اُن اصحاب میں زیادہ

دکھائی دیتا ہے جبکہ معبود حقیقی عابد کے قلب میں گھر کر لیتا ہے۔ اس میں کوئی خود شعوری نہیں ہوتی اور اگر اسے اپنی عبادت ہی کا خیال آتا ہے تو وہ خیال اس کے لئے ایک حجاب بن جاتا ہے اور عبادت میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ صوفیانہ مشرب کے حکماء نے اس حالت کا نام "جذب" رکھا ہے۔ جس میں سالک اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اُسے اپنے اعضائے جسمانی کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ نہیں جانتا کہ خارج میں کیا ہو رہا ہے۔ بلکہ خود اس کے قلب میں کیا گزر رہا ہے اس سے بھی بے خبر ہے۔ جب وہ ان تمام لواحق سے بالکل الگ ہو جاتا ہے تو اُس وقت اپنے مالکِ حقیقی کی طرف اور پھر مالک حقیقی میں سفر کرنے لگتا ہے۔ اگر اسے اتنا خیال بھی آجائے کہ کامل حالت جذب میں ہے تو ایک عیب ہے۔ کیونکہ جذب حقیقی کی صفت یہی ہے کہ خود جذب کا بھی شعور نہ ہو۔ اس راہ کی ابتداء رجوع الی اللہ سے ہے اور خدا میں سفر کرنا اس کی انتہا ہے۔ کیونکہ اسی دوسری حالت میں اسے جذب الی اللہ کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ ابتداءً تو یہ ایک ہلکی سی تجلّی کی سی کیفیت ہوگی جو آنکھ بھی محسوس نہ کر سکے۔ لیکن جب اسکی عادت ہو جاتی ہے تو قلب کو عالم رفیع میں لیجاتی ہے۔ اُس رفیع عالم میں جہاں حقیقت اولیٰ کا خالص اور پاک جلوہ نظر آتا ہے اور قلب انسانی میں روحانی دنیا کی شکل و صورت بس جاتی ہے

کیطرح ایک صاف و شفاف قلب ہوتی ہے۔ عالم کو قلم کے نشانات ہاتھ آتے ہیں، صوفی کے ہاتھ کیا آتا ہے؟ قدم کے نشانات۔ صوفی ایک شکاری کیطرح شکار کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ غزال خفتن کا راستہ معلوم کرتا اور اس کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ کچھ دیر تک تو ہرن کے نقش قدم اس کے لئے مشعل راہ ہوتے ہیں، لیکن اس کے بعد تو صرف "خوشبوئے نافہ" ہی اسکی رہبر ہوتی ہے۔ مشک نافہ کی خوشبو پر ایک منزل طے کرنا دشت پیمائی اور نقش قدم کی سو منزلیں طے کرنے سے بہتر ہے۔"

"خوشبوئے نافہ" کا تعاقب جسے قرآن "فکر" کہتا ہے دراصل حقیقت کی طرف صوفیانہ سفر کا قدم اولین ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو خود ایک صوفی تھے اس سفر کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں:۔

"عبادت کے تین حجابات ہیں جن میں پہلا حجاب وہ عبادت ہے جو زبان سے کیجاتی ہے۔ دوسرا وہ ہے جس میں قلب شدید ریاضت اور مستحکم ترین ارادیت کے ساتھ ایسے نقطہ پر پہنچ جاتا ہے جہاں بڑی خواہشیں اس پر کوئی اثر نہیں کرتیں اور وہ الٰہی مسائل پر توجہ کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ تیسرا حجاب وہ ہے جبکہ قلب الٰہی مسائل سے کسی طرح ہٹ ہی نہیں سکتا اور عبادت کا اصل مغز اسی وقت

لئے چلتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس گوشت پوست کے ڈھانچے میں چلتی ہوئی سانس بلکہ ہمارے انسانی خون کی روانی تقریباً رک جاتی ہے اور ہم اپنے پیکرِ خاکی میں محوِ خواب ہوکر ایک زندہ روح بن جاتی ہیں اور ہماری آنکھ نظمِ کائنات کا جلال ہم آہنگی اور مسرت کی عمیق طاقت سے پُرسکون ہوکر اشیاء کی حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتی ہے۔ (مُنٹرن آبی)

واردات کا یہی وہ عالم ہے جس کا انسان خوگر ہو جائے تو یہ اس قدیم یقین کی نشان دہی کرتا ہے جسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ "اللہ کی جانب سفر" کہتے ہیں۔ اس منزل میں متعدد سنگ میل ہیں جن سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کی معراج "جذب" ہے۔

تاریخ اسلام میں ایسے بے شمار پُرخلوص مرد اور عورتیں گزری ہیں جو پہلے اُللہ کی طرف سفر، اور پھر اللہ میں سفر، کا مسلک اختیار کر کے اس عالم خاکی کی طرف واپس ہونے پر مائل نہیں پائی گئیں۔ اپنے اپنے مقام سفر کے اعتبار سے انہوں نے اپنی انفرادی ہستیوں کو یقیناً "تجلّی حق" سے منور کیا۔ لیکن یہ جماعت کیلئے کھوئے گئے۔ وہ اپنی انسانی فطرت کے میزان کا لحاظ رکھنے میں قاصر رہے۔ ایسے نفوس کو مجذوب کہا جاتا ہے۔ یہ اس نوع کے افراد نہیں ہیں جو قرآنی اصطلاح "نیابتِ الٰہی" کے فرائض انجام دے سکتے ہوں۔ اس کے بجائے تاریخ اسلام میں ہمیں ایسے روحانی شہسواروں کی ایک شاندار صف ایسی بھی ملیگی جو فرائض انسانی کا پورا احساس رکھتے ہوئے اپنے مقام سفر سے انسان کی طرف واپس آئے اور اپنے ساتھ

اور خدا کا جلال اُس پر منکشف اور متجلی ہونے لگتا ہے۔"

صوفیانہ تجربہ ایسا نہیں جو دوسرے کو منتقل کیا جا سکے۔ وہ شدت کیساتھ شخصی اور داخلی ہے۔ البتہ وہ ایک خیال کی صورت میں رونما ہو سکتا ہے۔ "قربِ الٰہی" کا یہی وہ منصب ہے جو ایک شخصی احساس وحدت کو ایک عالمگیر استفادیت کا محرک بناتا ہے۔ عام طور پر یہ صوفیانہ تجربہ وحدتِ حیات کے صرف ایک خفیف احساس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا:۔

"ایک ایسی شئے کا روح افروز احساس جو بہت عمیق طور پر سرایت کی ہوئی ہے جس کا مسکن غروب ہونے والے آفتابوں کی روشنی، دریائے محیط اور زندہ ہوا۔ فلک نیلوفری اور قلب انسانی ہے، ایک حرکت ایک روح جو ہر غور کرنے والی شئے اور ہر موضوع تصور پر اثر انداز ہوئی ہے اور ہر شئی میں جاری و ساری ہے۔

گاہ گاہ یہ احساس عمیق تر ہو جاتا ہے اور ایسی کیفیت یا وجدان میں بدل جاتا ہے۔

ایسی پاک وجدان۔
جس میں رمز الٰہی کا بار۔
اس سمجھ میں نہ آنے والی دنیا کا
تہکا دینے والا بار گراں اُٹھ جاتا ہے۔

وہ پرسکون اور رحمت بھری وجدان جن میں امن و مہر کی (لہریں) ہیں

باب چہارم

مشیتِ الٰہی

قرآن کی جامع ہدایت یہ ہے کہ ایمان لاؤ اور نیک عمل کرو۔ یعنی ایسا عمل جو علم پر مبنی ہو۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَھُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝

وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے خوش حالی اور نیک انجام ہے۔

سورۃ الرعد - آیۃ (۲۹)

لیکن کیا انسان اپنے ارادے اور عمل میں آزاد ہے؟ قرآن کی ہر موڑ پر ہمیں ایسی آیات ملینگی جو یہ اعلان کرتی ہیں کہ خدا کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ پھر بھی انسان اپنے عمل کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اور اسے جزاء کی امید اور سزا کا خوف دلایا گیا ہے اور پھر اس کے متوازی بیسیوں آیتیں ایسی ملتی ہیں۔ جن میں انسان کو ذہن پر زور ڈال کر حق و باطل میں امتیاز کرنے کی دعوت بھی دیجاتی ہے۔ اُس سے کہا جاتا ہے کہ :-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ۝ سورۃ الرعد - آیۃ (۱۲)

بیشک اللہ کسی قوم کی حالت میں (اسوقت تک) تغیر نہیں کرتا جبتک کہ وہ لوگ پہلے اپنی حالت کو

علم و عرفان کی وہ دولت بھی لئے آئے جو انہیں اپنی راہ معرفت میں حاصل ہوئی تھی اور جسے انہوں نے عام انسانوں میں پھیلا دیا۔ اسکی بلند ترین مثال خود رسول اکرمؐ کی ہے جنہوں نے حق کے قریب ترین مشاہدے اور معرفت کو جبکہ آپ مشرف بہ معراج ہوئے اور جس کا ذکر قرآن کے سورۃ النجم میں ہے ایک عالمگیر تنظیم نو کی صورت میں ڈھال کر پیش فرمایا۔ اس وقت قرآن کا کہنا ہے کہ

فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ہ	اس نے (اللہ تعالیٰ نے) اپنے بندے (پیغمبر)
مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ہ	پر وحی نازل کی جو کچھ نازل کرنا تھی اور جو
اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ہ	اس نے دیکھا اس کے (پیغمبر کے) قلب نے
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ہ	اسکو غلط نہیں جانا۔ اسکی نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ
لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ	بھٹکی۔ اس نے تو اپنے رب کی بڑی بڑی
الْکُبْرٰی ہ سورۃ النجم۔ آیۃ (۱۱ تا ۱۸)	نشانیاں دیکھیں۔

رسول اللہ کیلئے یہ صرف ایک منظرِ خیال نہ تھا بلکہ ایک معنی خیز تجربہ تھا اس معنی خیز تجربہ کو عالمگیر تنظیم نو کے سانچے میں ڈھلنا تھا جو "خاندان الٰہی" سے موسوم کیا گیا ہے اور جس کا ہر فرد ایک دوسرے کیلئے "گلہ بان" ہے۔

روحانی یا صوفیانہ تجربہ خواہ وہ کتنا ہی ناقابل انتقال ہو قرآنی مفہوم میں اپنا ایک مقصد رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ تجربہ ایک ایسی متحرک علم کی شان اختیار کرے کہ جس سے انسان میں وہ حرکتِ عمل پیدا ہو جس سے اس کو زمین پر نیابتِ الٰہی کے فرائض انجام دینے کے قابل بنائے۔

اس کشمکش میں نظریہ جبریہ کو نہ صرف کامیابی حاصل ہوئی، بلکہ اس وقت سے اب تک یہ نظریہ ذہن مسلم کے ساتھ اس طرح چمٹا ہوا ہے کہ اس اعتقاد میں جو کسی نہ کسی شکل میں قدیم سے مشرق میں رائج رہا ہے جسکی تصحیح قرآن نے کی تھی وہ مسخ ہو کر رہگئی۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر غیر مسلم یورپی نقادوں نے گاہ گاہ اسلام پر بے روک ٹوک حملے کئے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف قرآنی مشرب کو "خالی از محبت" قرار دیا ہے، بلکہ اس کے خدا کو ایک "بے رحم جابر" "ایک بڑا خود سر" اور ایک "غیر ہمدرد ناقابل تسخیر قوت" بنایا ہے۔ چنانچہ پالگریو صاحب (Palgrave) کہتے ہیں:۔

"غلامی اور ذلت کی سب کے لئے بلا امتیاز ایک ایسی سطح مقرر کی گئی ہے جسکی وجہ سے اسلام میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر کوئی فوقیت امتیاز یا بلند مرتبت کا جائز دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ سب کے سب ایک تنہا جابر قوت کے یکساں آلہ کار ہیں جو انہیں نقصان یا فائدہ پہنچائے، حق یا باطل کی طرف لیجائے، عزت یا ذلت، مسرت یا غم بخشنے کیلئے، اُنکی انفرادی صلاحیتوں یا نفع یا نقصان کا لحاظ کئے بغیر، انہیں استعمال کرتی ہے۔ صرف اس لئے کہ اسکی یہی مرضی ہے اور بس"

سر ولیم میور (William Muir) کہتے ہیں:۔

"اسلام میں دنیا کے ساتھ اللہ کا ربط کچھ ایسا ہے کہ نہ صرف

نہیں بدل لیتے جو انکے دلوں میں ہے (یعنی جبتک وہ اپنی حالت کو نہ بدل لیں)۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ سورۃ النجم - آیۃ (۳۹)

نہیں ہے انسان کیلئے مگر صرف وہی جسکی وہ کوشش کرتا ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ۝ سورۃ الشوریٰ - آیۃ (۲۹)

اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں کی وجہ سے ہے۔

ان بدیہی تضادات سے جو ہمیں آتے جاتے ملتے ہیں کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے؟ کیا انسان اپنے عمل میں اور ارادے میں آزاد ہے یا آزاد ہی نہیں ہے؟ کیا یہ گتھی سلجھائی جا سکتی ہے؟ ایسے ہی سوالات تھے جنکی وجہ سے اوائل تاریخ اسلامی میں ملّتِ اسلامی عمومی حیثیت سے دو نزاعی قوتوں میں بٹ گئی۔ ایک قدریہ جو اس امر کے قائل تھے کہ انسان آزاد اور مختار ہے، دوسرے جبریہ جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انسان کا ہر عمل کلیۃً مشیتِ ایزدی کے مطابق ہوتا ہے جسکا تعیّن پہلے ہی سے ہو چکا ہے۔ اگرچہ عہد عباسیہ میں اس نزاع نے انتہائی شدت اختیار کر لی، تاہم اوائل عہد بنو امیہ ہی میں نظریہ جبریہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں اتنا رس بس گیا تھا کہ اُس زمانے کے حالات کے مطابق اسے اپنے مقام سے ہٹانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس میں اضمحلال پیدا کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ بیرونی اثرات کے تحت ہوا، لیکن اسکا کلّی استحصال ممکن نہ تھا۔

یہ دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ آخر اس کے نزدیک "مشیتِ الٰہی" اور "قضا و قدر" جیسی اصطلاحوں کا حقیقی مفہوم کیا ہے اگر وہ چاہے تو آسانی کے ساتھ خود رسول اکرم صلعم کے حالاتِ زندگی کی طرف رجوع ہو کر ان سے کچھ جوابات حاصل کر سکتے تھے جیسا کہ اسلام کے ایک مطالعہ کرنے والے پروفیسر اردشیر سہراب جی واڈیا (Prof. Ardaser Sorabjee Wadia) نے جن کا مذہب زرتشتی تھا، اپنی تصنیف "میسج آف محمد" (Message of Mohammed) میں کیا، اسلام پر تقدیریت کے الزام کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

"اگر واقعی ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ مسئلہ تقدیریت کا اثر خود پیغمبر کی زندگی اور عمل سے زیادہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ کیونکہ قرآن کو پیش کرنیوالے اور اسکی وضاحت کرنیوالے تو وہی تھے۔ لیکن حضرت محمدؐ کے قلمبند شدہ واقعاتِ زندگی سے ان کے متعلق کیا معلومات حاصل ہوتے ہیں؟ ایک زندہ دل عہدِ طفولیت، ایک مصروف عہدِ شباب، ایک مہماتی جوانی کا زمانہ جس میں انہوں نے ایسے دو تجارتی سفر کئے کہ مہینوں تپتے ہوئے لق ودق ریگستانوں سے انہیں گزرنا پڑا، ایک بے قرار عہدِ بلوغ جس میں حیات اور عقبیٰ کے عمیق ترین مسائل پر غور وفکر کرتا تھا، اور جس میں روح کی ایک انتھک عرق ریزی رہی، اور ایک طول کھینچتا ہوا ادھیڑ عمر کا زمانہ جو مقابلتاً سکون سے تو شروع ہوا لیکن انکی زندگی کے انتہائی مجاہدانہ دور پر ختم ہوا، جو غزوات، محاصرات اور مہمات سے

ہر نہج کی آزاد ارادیت بلکہ عقل و فہم کے استعمال کی آزادی بھی ایک بے معنے سی شئے بن کر رہجاتی ہے۔ اللہ اتنا بڑا ہے اور اسکی بڑائی اتنی مطلق ہے کہ اسکے آگے انسان کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی۔ ہر خیر اور شر راست خدا ہی کیطرف سے آتی ہے۔ اِس کے فولادی قید و بند میں امید فنا ہو جاتی ہے، اور مایوسی ایک فلسفہ عام بن جاتی ہے۔"

کلارک (Clarke) کہتے ہیں کہ

"اسلام نے خدا کو تو دیکھا، مگر انسان کو نہیں دیکھا اُس نے خدا کے مطالبات تو دیکھے، مگر انسانی حقوق نہیں دیکھے۔ وہ اقتدار تو دیکھ سکا لیکن آزادی نہ دیکھ سکا۔ اس لئے اس نے شدید استبدادیت کی صورت اختیار کرلی اور بے جان رسم پرستی کا مظہر بن کر قعر اجل میں ڈوب گیا۔"

ایک مسلمان کیلئے اس قسم کی تنقیدیں تلخ و ناگوار ہونگی، لیکن اس کیلئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اسکی ابتدائی ذمہ داری قرون وسطیٰ کے اُن مسلم علماء اور ان کے متبعین پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے "مشیت ایزدی" کے قرآنی تصور کی جو عمل صالح کا ایک دائمی سرچشمہ تھا، نامناسب تعبیر کی، جسکی وجہ سے عمل صالح کے متعلق قرآن کا اصل مفہوم اور منشاء ذہن انسانی سے پوشیدہ ہوگیا۔ اور خود پسند نقادوں کو اسلام میں شدید تقدیریت کا مفہوم پیدا کرنے کا موقعہ مل گیا۔ سر ولیم میور اور دیگر مصنفین نے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے قرون وسطیٰ کے انہی علماء کی تفسیروں سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی اور ایک قدم آگے بڑھ کر خود قرآن سے سائنٹیفک طریقہ پر

تشریح پر جو قرآن کے مطابق "دین قیم" یا سیدھا دین ہے کافی توجہ نہیں کی۔ دیکھئے قرآن خود اس خصوص میں کیا کہتا ہے :۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ	پس تم یکسو ہو کر اپنا رُخ سیدھے اس دین یا
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ	راستہ کی طرف رکھو جو اللہ ہی کا راستہ ہے اور
عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ	جس پر انسان کو فطرتاً ڈھالا گیا ہے۔ اللہ کے
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ	راستہ میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی سیدھا
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝	دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

سورۃ الروم - آیۃ (۲۹)

واضح ہو کہ "فطرت اللہ" اور خلق اللہ درحقیقت "سنت اللہ" ہی کے مفہوم ہی میں مستعمل ہوا ہے جس کا ذکر سورۃ الفاطر آیۃ (۴۳) میں آیا ہے :۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ	پس تم اللہ کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۚ	پاؤ گے اور نہ اللہ کے طریقوں میں کوئی تغیر پاؤ گے۔

یہ سنت یہ طریقے اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات اور ہر شے میں نظم اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے وضع فرمائے ہیں اور قرآن کافی احتیاط سے اس پر زور دیتا ہے کہ یہ "سنت اللہ" اور یہ "خلق اللہ" دراصل "خلق الرحمٰن" ہے یعنی یہ کسی "ناقابلِ تسخیر غیر ہمدرد" یا "بے رحم جابر" قوت کی وضع کردہ نہیں ہے بلکہ ایک "رحمٰن و رحیم" رب کی مقرر کردہ ہے جو خواہ کتنا ہی ماورا کیوں نہ ہو پھر بھی رگِ گردن سے زیادہ قریب ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ سورۂ قٓ آیۃ (۱۶)

معمور تھا۔ اس قسم کا طویل اور سخت کوش دور عمل جسمیں زندگی کے نشیب و فراز، اس کے ناز و نیاز اور کرشمہ سازیاں آتی جاتی رہیں، اُس انداز کا نظر نہیں آتا کہ حالات کو مجہول طریقہ پر قبول کرلیا جائے یا ان حالات پر جس طرح وہ وقوع پذیر ہوں سرِ تسلیم خم کرلیا جائے جیسا کہ تقدیریت کا مفروضہ مفہوم ہے۔ اس کے برخلاف آپ کی زندگی کی رفتار تو کچھ ایسی ہے جس میں جد و جہد اور دلیرانہ سعی و عمل کیساتھ خدائے قادرِ مطلق کی مرضی کا پرخلوص اتباع ہوسکے۔"

اُن اسباب میں سے جو قرآن پر پردے ڈالنے کے ذمہ دار ہیں سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہمارے قدیم علمائے مذہب کی وہ ناکامی ہے جو انہیں قرآن کے مقصدِ حقیقی کے سمجھنے میں ہوی، اور جنہوں نے ازمنہ وسطیٰ کے اس مذہب کی داغ بیل ڈالی جو اسلام کے نام سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ قرآن کا حقیقی مقصد انسان کو "سنت اللہ" یا اللہ کے اصولِ حیات سمجھانا ہے اور اس غرض کیلئے وہ ایک خاص اسلوب سے اپنے موضوعات کو کچھ تو محکمات کی صورت میں اور کچھ متشابہات کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن ہمارے قدیم علماء کے پیشِ نظر تو "سنت اللہ" نہیں بلکہ "سنتِ عرب" تھی یعنی عربی مسلمانوں کے وہ آداب و رسوم جن کو حیاتِ نبوی کے بعد پیغمبر خدا کی سنت قرار دیکر مختلف فقہی ضوابط میں اس طرح مدوّن کیا گیا کہ وہ ہر شعبۂ زندگی پر حاوی ہیں۔ اور وہ اِس عمل میں اتنے منہمک ہوگئے کہ انہوں نے سنت اللہ، فطرت اللہ یا خلق اللہ کے مطالعے اور

ہیں اس حکمت یا دانش یا اس مقصد کے ساتھ جو اس میں پوشیدہ ہیں ملا کر سمجھا یا جائے۔ اور وہ بھی ایک خاص اسلوب سے جو قرآن کا اسلوب ہے۔ لیکن یہ اسلوب کسی مسلم درسگاہ میں کسی وقت بھی مطالعے کا موضوع نہیں رہا۔ اس کے برعکس قدیم علماء نے لفظیات قرآن خصوصاً متشابہات کے یا تو لغوی معنی لئے یا ان کی شرح و تفسیر میں قدیم عیسائی مفسرین کی طرح یونانی فلسفہ اور حکمت کے کلیات اختیار کئے، یا علم کلام کے نام سے خود منطقی مفروضے قائم کر کے قرآنی مکاتیب کو انہیں ڈھانچوں میں بٹھانے کی کوشش کی۔ ان میں سے بعض نے جن کی افتادِ طبع صوفیانہ تھی اس خیال سے کہ "کتاب والحکمۃ" میں جو لفظ حکمت ہے وہ قرآن کے کسی "باطنی مفہوم" پر دلالت کرتا ہے اور یہ مفہوم خاص طور پر متشابہات میں مضمر ہے، عجیب و غریب باطنی مفہوم پیدا کئے، حالانکہ لفظ حکمۃ کی ہرگز یہ صحیح تعبیر نہیں ہو سکتی جیسا کہ خود قرآن اسکی وضاحت کرتا ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	بے شک ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دیکر
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ	بھیجا اور ہم نے انکے ساتھ کتاب اور میزان کو
وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ	نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔
بِالْقِسْطِ ۚ سورۃ الحدید۔ آیۃ (۲۵)	(توازن برقرار رکھیں)

یہاں "میزان" کا لفظ کتاب کے ساتھ وہی مناسبت رکھتا ہے جو حکمۃ کا لفظ کتاب کے ساتھ کتاب والحکمۃ میں رکھتا ہے اور مفہوم کے اعتبار سے لفظ حکمت کا مترادف سمجھنا چاہئے۔ حکمۃ یقیناً میزان ہے،

اور ہر ایک کی آواز سنتا ہے جو اسے پکارتا ہے۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ ۝ سورۃ البقر۔ آیۃ (۱۲۶) یہی سنت اللہ دراصل مشیتِ الٰہی ہے اور انسان کو ایک پُرامن اور منظم زندگی بسر کرنے کیلئے اس سے ہم آہنگی پیدا کرنی ضروری ہے۔

جیسا کہ ہم نے اُوپر واضح کر دیا ہے کہ سنت اللہ کی تشریح کیلئے قرآن اپنا ایک خاص اسلوبِ بیان رکھتا ہے اور اُسی کی موزونیت سے وہ مناسب لفظیات استعمال کرتا ہے۔ "فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ" ۝ سورۃ قٓ۔ آیۃ (۴۵) "قرآن کو بہ انداز قرآن بیان کرو" یہ وہ ہدایت ہے جو خود قرآن نے دی ہے۔ یہ ہدایت خاص طور پر اس لئے ضروری تھی کہ اسے عہد نبوی کے اَن پڑھ عربوں کو جن کی زبان اور محاوروں میں اس کا نزول ہوا تھا اپنا مفہوم سمجھانا تھا اور اس انداز میں سمجھانا تھا کہ وہ مطالبِ قرآن کو واضح طور پر سمجھ سکیں۔ قرآن کہتا ہے:-

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ سورۃ الجمعہ۔ آیۃ (۲)	وہ (اللہ) وہی ہے جس نے اَن پڑھ ناخواندہ لوگوں میں سے ایک کو پیغمبر بنا کر بھیجا جو انکو اسکی (اللہ کی) آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انکو پاک کرتا ہے اور انکو کتاب اور حکمت (دانائی) سکھاتا ہے اور اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی (صریح) گمراہی میں تھے۔

یہاں اصل ہدایت یہ ہے کہ کتاب کے اُن انکشافات کو جو اس میں موجود

تمثیل کا اسلوب ہے جو ہر ذہنی منزل پر بہ آسانی ہر انسان کیلئے فہم و ادراک میں آسکتا ہے۔ اس اسلوب کی پسندیدگی کا احساس مختلف ذہنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف ہوسکتا ہے، لیکن اسکی عام حیثیت تو صرف ایک ہی رہیگی اور وہ یہ کہ بہ آسانی سمجھ میں آسکے۔

تخلیق

قرآن زندگی کا جو بنیادی تصوّر پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ سارا عالمِ اور ہر وہ شئی جو اس میں موجود ہے چند مستحکم اور مستقل قوانین کے ذریعہ قائم ہے جو ہر شئی کی فطرت کے مطابق اس کی سرشت میں ہم آہنگی کے ساتھ موجود و کارفرما ہیں۔ یہ قوانینِ فطرت یعنی سنت اللہ، لازماً ناقابلِ تغیر ہیں اور انسانی زندگی کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اس توازن کی مدد سے جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰهَا۔ اُن قوانینِ حیات کے ساتھ تعاون کرے۔ یہ قوانین قرآنی اصطلاح میں "مشیّتِ ایزدی" کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی امکانی صلاحیت کے مطابق ان پر عمل کرے تاکہ وہ ایک منظم پُرامن زندگی بسر کرسکے۔ قرآنی مفہوم میں اسی کا نام "تسلیم و رضا" ہے۔

اس بنیادی اصول کو ذہن نشین کرنے کیلئے قرآن بار بار انسان کی اُس غفلت کو یاد دلاتا ہے جو اس نے ان چیزوں کو دیکھنے اور ان پر غور کرنے میں روا رکھی ہے جو اس کو صاف صاف نظر آسکتی ہیں۔ فطرت کا وہ وسیع منظر، آسمانوں میں گردش کرتے ہوئے حسین اجرامِ فلکی جن سے زمین کو گردشِ

یعنی وہ عقلی بنیاد جس پر کتاب یعنی وحی قایم ہے، اور بنی نوع انسان کو "توازن قائم رکھنے" اور ایک متوازن زندگی بسر کرنے میں مدد دیتی ہے بہت کم اشخاص نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ متشابہات بھی محکمات کی طرح ان ہی ان پڑھ لوگوں کو سمجھانے کیلئے تھیں جن کے لئے اور جن کے درمیان اور جن کی زبان میں قرآنی مطالب پیش کئے گئے تھے۔ نتیجتاً متشابہات کا منشاء بھی یہی ہے کہ وہ عوام کیلئے بھی قابل فہم ہوں۔ کسی تشبیہ و استعارہ کا مقصد اگر کسی حقیقت کا حامل ہے تو یہ ہے کہ جو مفہوم سادہ زبان میں ادا ہوا ہے، یا ہو سکتا ہے، اسکی تصویر جامع طور پر بہ یک نظر سامنے آجائے۔ اس لئے قرآنی متشابہات کے ایسے بھی غیر معمولی مطالب نہیں لئے جانے چاہئیں جو محکمات کے مطالب و معانی سے بالکل مختلف ہوں۔

قرآن مجید در اصل جیسا کہ اس کا ادعا ہے ایک اخلاقی ضابطہ حیات ہے۔ اسی لئے اسکے سمجھانے کا طریقہ بھی لازماً راست اور بلا واسطہ ہے۔ ایسے فقروں سے جو بار بار دہرائے گئے ہیں مثلاً "زمین پر چلو پھرو اور پھر تم خود دیکھ لو کہ منکرین کا کیا انجام ہوا" قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ سورۃ الانعام - آیۃ (۱۱) "سمجھنے والوں کیلئے یہاں نشانیاں موجود ہیں" إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ سورۃ الرعد - آیۃ (۴) "ان لوگوں کیلئے جو فکر کرتے ہیں" إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ سورۃ الرعد - آیۃ (۳) قرآن کے انداز تخاطب کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اسلوب مشاہدہ اور

جب کبھی وہ ان کے سمجھنے میں یا ان سے مطابقت کرنے میں کوتاہی کریگا اس کا نتیجہ لازمی طور پر اس کے لئے نقصان رساں ہوگا۔ قرآنی اسلوب میں اس مفہوم کو یوں ادا کیا گیا ہے:۔ "یہ اللہ کی مرضی ہے" دوسرے الفاظ میں قانون کو اپنا راستہ اختیار کرنا ہی ہوگا اور سبب کو اپنا نتیجہ ظاہر کرنا ہی پڑیگا۔ یہ وہ نظامِ حیات ہے جسے قدرتِ الٰہی نے وضع کیا ہے، اور انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ اس نظام "سنت اللہ" میں کوئی تغیر پیدا کرے۔ یہی وہ اصل مقامِ حیات ہے جہاں انسان لازماً خدائی مرضی کے ساتھ رہنے یا اس قانونِ حیات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے، اگر وہ چاہتا ہے کہ آزادی یا اپنی مرضی کے ساتھ اس سے مستفید ہو۔

قرآن گاہ گاہ اُن انسانوں کا ذکر کرتا ہے جو صراطِ مستقیم پر چلنے سے انکار کرتے ہیں، اور اپنی اس حرکت پر شدت کے ساتھ مُصر رہتے ہیں۔ قرآن ان کے متعلق یہ کہتا ہے۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا" سورۃ الاعراف۔ آیۃ (۱۷۸) "وہ دل رکھتے ہیں مگر محسوس نہیں کرتے، آنکھیں رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں مگر سنتے نہیں"۔ یہاں پھر غفلت اور ارادی غفلت کے طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت کردہ توازن کے خلاف برتی جاتی ہے۔ اس صورت میں زندگی کا قانون اپنا اثر ضرور دکھائیگا۔ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" سورۃ البقرۃ آیۃ (۷)

لیل و نہار اور ظلمت و نور ملتے ہیں، بلند پرواز بادل جو زمین کو شاداب کرنے کیلئے آسمان سے پانی برساتے ہیں، وہ ننھا سا تخم جسے انسان زمین میں بوتا ہے اور جس سے اس کی غذا کے لئے لہلہاتی کھیتیاں اُگتی ہیں، وہ قطرۂ آب جس سے خود انسان اپنا وجود حاصل کرتا ہے، اور اسی قسم کے سینکڑوں اشیاء اسے اشارہ کرتی ہیں کہ ایک قانونِ رحمانی ــ خلق الرحمٰن ــ ان تمام امور کو جنہیں وہ اپنے حواس کے ذریعہ دیکھتا یا محسوس کرتا ہے تھامے ہوئے ہے، قرآن پُرزور الفاظ میں کہتا ہے کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ سورۃ الانبیاء۔ آیۃ (۱۶) "آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے تفریح کیلئے نہیں خلق کئے گئے ہیں"۔ بلکہ ان کا ایک سنجیدہ مقصد و مآل ہے، ہر خلق کی ہوئی شئے اپنے بطون ہی میں رکھے ہوئے قانون کے تابع ہے، تاکہ وہ اپنی تخلیق کا مقصد پورا کرے۔ انسان جسکی فطرت میں توازن اور امتیاز کی صلاحیت رکھی گئی ہے، اپنے وجود کے جبلّی قوانین سے موافقت کرے اور اُن ضوابط سے بھی ہم آہنگ رہے۔ جو خارجی دنیا میں کارفرما ہیں۔ قرآن کہتا ہے یہی ہے صحیح دین اور یہی ہے سنت اللہ کا اتباع جس کے لئے انسان خلق کیا گیا ہے اور فطرتاً موزوں ہے۔

اس لئے جب کبھی قرآن اس امر پر زور دیتا ہے کہ کوئی امر بغیر اللہ کی مرضی کے انجام نہیں پاتا تو اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس شے میں جو جبلّی قانون کارفرما ہے وہ اپنا کام کر رہا ہے، اور بالآخر وہ اپنی راہ خود طے کریگا۔ زمین پر انسان کا وظیفۂ حیات یہ ہے کہ وہ ان قوانین کو سمجھے، اور ان سے توافق کرے۔

اللہ کی طرف بڑھتا ہے تو اللہ اسکی طرف دو قدم بڑھتا ہے۔"

جو نکتہ یہاں قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ عمل اور اصلاح کا پہلا قدم انسان ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی قانونِ حیات ہے اور یہی مرضی الٰہی۔ افراد کیلئے بھی اور اقوام کیلئے بھی اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ سورۃ الرعد۔ آیۃ (۱۲) "اللہ کسی قوم کی حالت میں (اس وقت تک) تبدیلی نہیں کرتا جبتک کہ وہ لوگ اس چیز کو نہیں بدل لیتے جو انکے دلوں میں ہے" یعنی جبتک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدل لیں۔

انسان کی آزادی فکر و عمل سے متعلق قرآنی الفاظ "ہماری مرضی ہے" "ہم نے مقدر کیا ہے" وغیرہ کا مفہوم صاف طور پر حسبِ ذیل آیات سے واضح ہے۔ یہ آیات سادہ ترین زبان میں ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہئے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۝ سورۃ العنکبوت۔ آیۃ (۶۹)	وہ لوگ جو ہمارے لئے (ہماری راہ میں) کوشش کرتے ہیں (مشقت اٹھاتے ہیں) ہم ضرور انکو ہماری راہ دکھائینگے۔
مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ سورۃ بنی اسرائیل آیۃ (۱۵)	جو شخص صحیح راستہ (راہ ہدایت) اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی ہی بھلائی کیلئے اختیار کرتا ہے اور جو غلط راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی نقصان کیلئے اختیار کرتا ہے اور کوئی شخص (جو اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے) کسی

"ہم نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے" انجام کو ظاہر کرنے کا یہ ایک قرآنی انداز ہے۔

قرآن نے بار ہا ان لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو غلط راہ پر گامزن ہو کر یا کسی قانونِ حیات سے غفلت برت کر درمیان میں سہم جاتے اور آنے والے نتائج پر نگاہ ڈال کر تلافی مافات کیلئے اُلٹے پاؤں ہونا چاہتے ہیں۔ اس وقت وہ قانونِ حیات جس کی طرف وہ لوٹتے ہیں، ایک تازہ توانائی کے ساتھ ان کی مدد کیلئے کارفرما ہوتا ہے۔ (اس طرح) تقدیر یا نتیجۂ لازمی کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ یہ مقام توبہ و استغفار کا ہے۔ وَيَهْدِيٓ إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ۝ سورۃ الرعد آیۃ (۲۷) "جو کوئی اس کی (اللہ کی) طرف رجوع ہوتا ہے (قانونِ حیات، سنت اللہ کی طرف) تو وہ (اللہ) اپنی طرف رجوع کرتا ہے"۔ وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُۥ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ ۝ سورۃ النساء۔ آیۃ (۱۱۱) "جو کوئی گناہ کرتا ہے، وہ خود اپنی ہی ذات کو نقصان پہنچاتا ہے"۔ قرآن اپنے خاص رحیمانہ انداز میں یہ بھی یاد دلاتا ہے۔ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ ٱلرَّحْمَةَ أَنَّهُۥ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوٓءًۢا بِجَهَٰلَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُۥ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ سورۃ الانعام۔ آیۃ (۵۴) "تمہارے رب (پروردگار) نے (ایک قانون) رحم (رحمت) کو اپنے لئے مقرر کر لیا ہے وہ یہ کہ تم میں سے جو کوئی نادانی اور جہالت سے کوئی بُرا کام (گناہ) کر بیٹھے اور پھر اسکے بعد توبہ کرلے اور نیکوکار ہو جائے (اصلاح کرلے) تو بیشک وہ (اللہ) بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں کہ "انسان اگر ایک قدم

ظاہر ہوتی ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ نَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دُعَاءٍ لَّا یُسْمَعُ ۝ "اے اللہ میں اس نفس سے پناہ مانگتا ہوں جس سے سیری نہ ہو اور اس دعا سے جو تیرے نزدیک قابل قبول نہ ہو" یہ احساس توازن یا قانون ہم آہنگی جو قرآنی اعلان کے مطابق ساری کائنات کو سنبھالے ہوئے اور اس میں جاری وساری ہے، انسانی زندگی کے حدود میں ایک اعلیٰ ترین روحانی قانون بن جاتا ہے، اور انسان کی آزاد مرضی کے ساتھ اس کے ہر عمل میں خواہ وہ اسکی ذات سے متعلق ہو یا دنیائے خارجی سے متعلق ہو نفوذ کئے ہوئے زندگی کے رفیع ترین مقاصد کے حصول کیلئے اسکی توانائیوں کی رہبری کرتا ہے۔ یہی ایمان لانے اور عمل کرنے کا طریقہ ہے۔

"احساسِ توازن" انسان کے اندر ایک ایسی کارگر قوت ہے جس سے اسکے جملہ اعمال کی جانچ ہونی چاہئے۔ اسکو چاہئے کہ جس طرح ایک خارجی منظم زندگی بسر کرنے کیلئے ضروری ہے کہ فطرت کے عام قوانین سے توافق کرے، اسی طرح داخلی سکون حاصل کرنے کیلئے بھی لازم ہے کہ وہ ان قوانین کا احترام کرے جو اس کے باطن میں کارفرما ہیں۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ (آیاتٌ) ۝ سورۃ الذاریات - آیۃ (۲۱) "اللہ کی نشانیاں خود تمہارے نفوس میں ہیں" یہ مشیتِ الٰہی کے اجزائے ترکیبی ہیں اور ان سے بھی مطابقت پیدا کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ اس عمل توافق میں ایک سخت کوشی مضمر ہے اور یہ سخت کوشی اس شخص کو برداشت کرنی ہی ہوگی جو اس کی زندگی کے منشاء کے مطابق عالم بہ عالم منزلِ تکمیل تک پہنچنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت اس عملِ ارتقا سے ملتا ہے جو کارخانہ قدرت میں کارفرما ہے۔ جو تخم زمین میں بویا

دوسرے کی (ذمہ داری کا) بوجھ نہیں اُٹھائیگا۔

اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۔ سورۃ آل عمران آیۃ (۱۹۴)

میں تم میں سے کسی عمل کرنیوالے کے عمل کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا

سورۃ الشمس۔ آیۃ (۷ تا ۱۰)

قسم ہے جان کی اور اسکی جس نے اسکو درست اور ٹھیک بنایا اور پھر اسکو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (اختیار کرنے) کی سمجھ دی۔ پس خوش نصیب (کامیاب و کامران) ہے وہ جس نے اسکو (نفس کو) پاک رکھا اور (بدنصیب) ناکام ہے وہ جس نے اسکو ناپاک اور گندہ خاک آلودہ کر دیا۔

اِس وقت تک یہ امر یقیناً واضح ہو گیا ہو گا کہ قرآن انسانی تجسس پر خواہ وہ فکر کی صورت میں ہو، یا علم کی، یا فعل کی صورت میں کوئی قیود عائد نہیں کرتا سوائے اُن قیود کے جو اُس احساس توازن کی روشنی میں جو فطرتِ انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے وہ خود اپنے اُوپر عائد کرلے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے حدود سے یعنی اپنی صلاحیتوں اور کمزوریوں سے واقف ہوتے ہوئے یہ سوچ لے کہ آیا جو کام وہ کرنا چاہتا ہے مناسب حال ہے یا نہیں۔ احساس توازن کے استعمال کا یہی صحیح طریقہ ہے۔

اس معاملہ میں رسول اکرمؐ نے خود جو احتیاط رکھی تھی وہ اس دعا سے

اور اگر انسان اپنی زندگی کو خوش حال رکھنا چاہے تو ان کی تکمیل ضروری ہے۔
عقل ان شرطوں کا ساتھ دیتی ہے۔
ہم انہیں ٹھکراتے ہیں، اور دنیا کے لئے۔
ایک غیر صحیح راستہ تجویز کرتے ہیں اور اپنے لئے بے جا اقرار۔

ہم دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
اور پھر فضول خرچ بھی بنے رہتے ہیں۔
ہم صحت مند رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔
لیکن اپنے جسم کا بیجا استعمال ترک نہیں کرتے۔
ہم اپنی ہی دعاؤں کو آپ رد کرتے ہیں عنفوان شباب سے لیکر زندگی کے آخری منازل تک،

ہم تسکین قلب چاہتے ہیں،
پھر بھی ہم اپنے قلب پر نظر نہیں رکھتے۔
ہم مصیبتوں سے بچنا چاہتے ہیں،
پھر بھی گناہوں سے باز نہیں آتے۔
ہم ہمیشہ خوش آئند نتائج چاہتے ہیں لیکن کٹھن ذرائع اختیار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

جاتا ہے، اسے ایک ذائقہ دار ثمر بننے کیلئے مختلف قسم کی مزاحمتوں سے کافی دیر تک سخت کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ خود لطفہ انسانی کو شکم مادر میں بچے کی شکل اختیار کرنے سے پہلے کتنی کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اخلاقی اور روحانی منزلِ تکمیل تک پہنچنے کیلئے انسان کو ناگزیر صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ یہ صعوبتیں اس کی آزمائش اور اسکو ایک خوب تر سانچے میں ڈھالنے کیلئے ہوتی ہیں۔ وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۝ سورۃ الانبیاء۔ آیۃ (۳۵) "تمہاری آزمائش کیلئے برائی اور بھلائی کے ذریعہ ہم تمہارا امتحان لیتے ہیں"۔ یہ ہے زندگی کا قانون، سنت اللہ، اللہ کی عادت، یا اس کا طرزِ عمل، اور ہر انسان کو اسے برداشت کرنا، یا اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ یہ انسان ہی کے فائدے کیلئے ہے۔ اس سے اس کا مقام اونچا ہوگا۔ اس سے چون وچرا کرنا گویا خود اپنی ترقی کے مواقع سے انحراف کرنا ہے۔

جب انسان یہ احساس توازن قائم رکھنے میں ناکام ہوتا ہے، یا اپنی زندگی کو اس صحیح زاویہ نظر کے سانچے میں بٹھانے سے قاصر رہتا ہے، تو اس کا یہ عمل ہی اس کے لئے آفت و مصیبت بن جاتا ہے۔ یہ کمزوری بنی نوع انسان کی ایک عام کمزوری ہے، کیونکہ قلب انسانی کی گہرائیوں میں آسائش کی ایک بے قرار تشنگی رہتی ہے اور وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ دنیا اُسے بجھائیگی۔ انسان اپنی خواہش کو اپنے حقوق کا پیمانہ بناتا ہے۔ لیکن دنیا تو اپنی راہ لگی رہتی ہے۔ تو نتیجتاً وہ مایوس ہو کر خدا اور تقدیر کو بُرا بھلا کہنے لگتا ہے۔

"زمانے کی روش اپنی خاص شرطیں پیش کرتی ہے۔

جن کو لازماً پہلے ہی سے سوچ لیا گیا تھا' یا جو ارادۂ ماقبل کا نتیجہ ہیں، جس طرح ہر انسانی منصوبہ اس کے عمل میں لانے سے قبل ارادۂ ماقبل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ انسان کے منصوبے میں پیش آنے والے امور کی ماہیت کا علم چونکہ محدود ہوتا ہے' اس لئے اپنے تجربہ کی بناء پر وہ انہیں بدلتا رہتا ہے' لیکن خدا کا علم چونکہ ہر شئی کے متعلق کامل اور محیط ہوتا ہے اس لئے اس کی اختیار کردہ روش میں کسی تبدیلی کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ خدا اپنے معین طریقوں' یا قوانین فطرت' یا زندگی کے مبادی اصولوں اور ان کے آثار بڑھاؤ کو کبھی نہیں بدلتا۔ یہ بلا شرکت غیر الٰہیت کے خاص میدان ہیں اور انسان بہ حیثیت انسان ان سے باز پرس کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رکھتا' کیونکہ وہ ان قوانین کے عمل کو نہ تو صحیح زاویے سے دیکھ سکتا ہے اور نہ انکی حیثیت کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس کا کام صرف یہ ایمان رکھنا ہے کہ یہ "خلق الرحمٰن" یعنی وہ قوانین ہیں جن کو خدا نے بنایا ہے' اُس خدا نے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ اس لئے وہ لازماً خیر ہیں۔ انسان کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ وہ ان کا صحیح استعمال کرے۔ ان قوانین کے ساتھ ہر ردِ عمل کا نام تقدیر ہے۔

تقدیر کا دوسرا مفہوم خود انسان کے دائرہ عمل سے تعلق رکھتا ہے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۝ سورہ بنی اسرائیل آیۃ (۱۶)

جو شخص صحیح راستہ (راہِ ہدایت) اختیار کرتا ہے وہ اپنی ہی بھلائی کیلئے اختیار کرتا ہے اور جو غلط راستہ (گمراہی) اختیار کرتا ہے وہ تو اپنے ہی

ہم وہ نہیں کرتے جو ہمیں کرنا چاہئے۔
اور جو نہیں کرنا چاہئے وہ کرتے ہیں۔
اور اس خوش حالی کا سہارا لئے رہتے ہیں۔
کہ کسی نہ کسی طرح ہمارا کام نکل ہی جائیگا۔
لیکن ہمارے اعمال خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے ہم سے قوی تر ہیں۔
(امپی ڈاکلس آن ٹینا)

"دنیا کی روش"، جس کا ذکر امپی ڈاکلس Empedocles کرتا ہے، قرآنی الفاظ میں اللہ کا طریقہ، یا اس کی سنت ہے۔ یہ ان شرائط کا اثبات کرتا ہے جن سے انسان کو آسودگی حاصل ہو۔ عقل اس کا ساتھ دیتی ہے۔ لیکن انسان اسے ٹھکراتا اور اپنے لئے راستے تراشتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی مصیبت آپ مول لیتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو احمق بناتا ہے اور اپنی ہی حماقتوں کا شکار بنتا ہے۔ بیوقوفی اپنے ہمراہ مصیبتیں لاتی ہے۔ یہ ہے قانونِ حیات، فیصلۂ الٰہی، قسمت یا تقدیر۔ قرآن کہتا ہے:۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ۝ سورۃ الشوریٰ۔ آیۃ (۲۹) جو مصیبتیں تم پر آتی ہیں وہ اپنے ہاتھوں آپ لائی ہوئی ہوتی ہیں۔"

قرآن میں لفظ تقدیر تین وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اولاً وہ جسے ہم مشیتِ ایزدی یا قانونِ قدرت کی کارفرمائی سے موسوم کرتے ہیں یعنی فطرت اللہ، خلق اللہ، یا سنت اللہ۔ یہ زندگی کے اس منصوبہ کے خدوخال ہیں

"نہ خود ہماری اپنی کوئی کمزوری ہماری زندگی کی بربادی کا باعث ہیں
نہ قدرت کی غیر بشری قوتیں ہمارے لئے مصیبت لاتی ہیں،
لیکن دوسروں کی بداعمالیاں ہماری زندگی کو اکثر تاریک بناتی ہیں"۔

اس مقام پر تقدیر دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جو لوگ ان مصیبتوں کا شکار ہوئے ہیں انہوں نے وقت پر ان بُرے رجحانات کا اندازہ نہ کیا ہو جو دوسروں میں ابھر رہے ہوں، اور اس لئے انہوں نے ممکنہ مناسب طریقے پر ان کا ضروری تدارک نہ کیا ہو یا ان کی غلط کاریوں کو نہ روکے ہوں۔ یا دیدہ و دانستہ وہ مداخلت کرنے سے باز رہے ہوں۔ ایسی صورت میں کنارہ کشی کا خمیازہ بھگتنا لازمی ہے۔ اس کا الحاق انفرادی زندگی یا قومی یا بین الاقوامی زندگی پر یکساں ہوتا ہے۔ اس دنیا کی بہت سی مصیبتوں کو بشمول اُن آفتوں کے جو جنگ سے پیدا ہوتی ہیں وہ اشخاص بہ آسانی روک سکتے ہیں جو بے اعتنائی یا رواداری کے غلط تصوّر کی وجہ سے جو بعض اوقات گرد و پیش کے حالات سے مجرمانہ غفلت کی حیثیت رکھتے ہیں، شر و فساد کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں۔ نتیجتاً صرف اس شخص پر آفت نہیں آتی جو بُرے اعمال کا مرتکب ہوتا ہے، بلکہ وہ لوگ بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں جو بظاہر تو معصوم نظر آتے ہیں لیکن جو غلط کاریوں کو روکنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہ ہے قانونِ حیات، یہ ہے تقدیر۔ وقت پر دوسروں کی بُرائی کے انسداد سے بے پرواہی برتنا درحقیقت اس شر میں حصّہ لینے کے برابر ہے۔

نقصان کے لئے اختیار کرتا ہے۔

بھلائی یا برائی کیلئے ہمارے اپنے اعمال ہی فیصلہ کن قوت ہیں۔ یہ بھی تقدیر ہے۔ اس مقام پر انسان اپنی قسمت کا آپ معمار ہے۔ وہ احساس توازن جو اسکی فطرت میں رکھا گیا ہے، یا وہ قوتِ فرق و امتیاز جو اس میں ودیعت کیگئی ہے، ہر حالت میں اس کے لئے آخری رہبر ہونا چاہئے تاکہ وہ آسانی سے فرق کر سکے کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا ہے۔ انسانی طرزِ عمل سے متعلق قرآن نے چند قطعی احکام صادر کئے ہیں، اور وہ ایسے ہیں کہ عقل اور تجربہ اسکی بآسانی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ احکام نظم و امن کیلئے کام کرنیوالے اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور اس کا پتہ دیتے ہیں کہ زندگی میں کن امور سے پرہیز کرنا چاہئے اور کن امور کو اختیار کرنا چاہئے۔ یہ احکام و ہدایت ان اصولوں کو اُجاگر کرتے ہیں جو عالم فطرت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کارفرما ہیں۔ اس نکتۂ نگاہ سے انہیں بھی "مشیتِ الٰہی" کی علامتیں تسلیم کرنا اور ان سے بھی توافق کرنا ہوگا۔ ان سے موافقت کرنے یا ناموافقت برتنے سے متضاد نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ان دونوں کو بھی تقدیر کہا جاتا ہے۔

آخر میں ہمیں اُس ردِّ عمل پر بھی غور کرنا ہوگا جو دوسروں کی وجہ سے ہماری زندگی پر رونما ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان سے ہمیں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مسرت بظاہر غیر متوقع معلوم ہوگی لیکن دوسروں کے اچھے کاموں سے خوشی حاصل کرنیکی صلاحیت خود ہماری نیک نفسی و نیک نہادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ تقدیر کی یہ بھی ایک شکل ہے۔ بعض اوقات دوسروں کے اعمال ہمارے لئے رنج و مصیبت لاتے ہیں۔

تاریک ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا جیسا کہ امپی ڈاکلس سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس یہ تو وہ سزا یا خمیازہ ہے جو دوسروں کی بداعمالیوں کو آزادی کے ساتھ جاری رہنے دینے کی وجہ سے بھگتنا پڑتا ہے۔

اسی مسئلہ کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ ہم شر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، اس سے جہاد بھی کرتے ہیں، اور ان کے علاوہ بھی جو کچھ ہم سے ہوسکتا ہے کرتے ہیں پھر بھی برائی ہی فتحمند ہوتی ہے اور نتیجتاً اپنے ساتھ مصیبتیں لاتی ہے۔ یہ بھی تقدیر ہے لیکن اس سے زندگی میں احساسِ تاریکی پیدا ہونے نہ دیں۔ کیونکہ یہ احساس ایک قسم کی مایوسی یا شکست کا احساس سمجھا جائیگا۔ قرآن ہمیں اس قسم کے احساس کی بیداری یا پرورش سے منع کرتا ہے۔ اس کو تو برداشت کرتا ہے اور ہماری ناکامی کو ایک اخلاقی فتح میں بدل دیتا ہے۔ یہ ہے عمل صالح۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ	قسم ہے زمانے کی بیشک انسان بڑے ہی گھاٹے
لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ	اور نقصان میں ہے بجز ان لوگوں کے جو ایمان
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لائے اور نیک کام کئے اور باہم حق کی تاکید
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا	اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔
بِالصَّبْرِ ۝ سورۃ العصر۔ آیۃ (۱تا۳)	
وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً	تمہاری آزمائش کیلئے برائی اور بھلائی کے
سورۃ الانبیاء۔ آیہ (۳۵)	ذریعہ تمہارا امتحان لیتے ہیں۔

وہ مصیبت جو سچائی کو قائم رکھنے میں جھیلنی پڑتی ہے ایک قسم کا امتحان ہے اور جو

اس مقام پر ہمارے سامنے قرآن کا وہ مسئلہ آتا ہے جو جہاد کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بھی کفر کی طرح ایک ایسی اصطلاح ہے جو ان غیر مسلم حلقوں میں قابل نفرین قرار پاتی ہے جو اس کے قرآنی مفہوم سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ اس اصطلاح کے لغوی معنی ہیں "سخت کوشش" یا ہر اس برائی کے خلاف کوشش جو خیال یا احساس یا عمل میں موجود ہو۔ یہ پُرامن زندگی کیلئے ایک شرط لازم ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بلند ترین اور صبر آزما صورت وہ جہاد ہے جو خود اپنے نفس کے برے رجحانات کے خلاف کیا جائے۔ اندر سے اٹھنے والی مذموم خواہشوں کے خلاف جنگ کرنا اور زندگی کو ان راستوں پر لے آنا جن سے سکونِ باطن حاصل ہو، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے جہاد سے مراد ان لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانا ہے جو دنیا کے امن میں خلل انداز ہونے پر تلے ہوں، یا زندگی کی نیکیوں کو تباہ کرنے کا عزم رکھتے ہوں، لیکن اپنے نفس سے جہاد کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ اس لئے اسے جہاد اکبر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اپنے نفس سے جہاد کرنے میں دریغ کرنا اپنی خودی کو عمداً تحلیل کرنا ہے۔ اسی طرح بہر صورت اپنی فکر اور عمل سے اپنے اطراف کی برائی کا انسداد نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اجتماعی مسرتوں کی شکست وریخت میں حصہ لینا۔ ہم جب کبھی دوسروں کی بداعمالیوں کو روکنے سے دستکش ہونگے تو ان بداعمالیوں کے بُرے نتائج میں ہمیں خود مبتلا ہونا پڑیگا۔ اِس بناء پر دوسروں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ہماری زندگی کے

نتیجہ ابتداً تشفی بخش نظر نہ آئے۔ لیکن اسکی حقیقی آخری صورت کیا ہوگی اس کا تو علم اللہ کو ہے۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ سورۃ البقرہ۔ آیۃ (۲۱۶)

ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو نہ پسند کرو اور وہ تمہارے لئے (تمہارے حق میں) اچھی ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے (تمہارے حق میں) بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے۔ تم نہیں جانتے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۗ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

سورۃ ہود۔ آیۃ (۱۲۳)

آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں اللہ ہی سے وابستہ ہیں اور تمام امور اسی کی طرف رجوع ہونگے۔ پس تم اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو اور تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے تمہارا رب بے خبر نہیں ہے۔

اس لئے انسان کا فرض بس اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ سیدھی راہ پر عمل کرے اور باقی خدا پر چھوڑ دے۔ وہ اپنے طریقِ عمل کو خدا کے طریقِ عمل کے موافق بنائے۔ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے ساتھ رکھے اور زندگی کی آزمائشوں کو سچائی اور استقامت کے ساتھ برداشت کرے۔ یہی امتیازی ہدایت ہے کتابِ الٰہی کی۔

آخر یہ تو نہیں کہ قبر کی اِس جانب کی زندگی ہی مکمل زندگی ہو۔ اسکے بعد کی زندگی بھی تو اہمیت رکھتی ہے جو اسی کا ایک سلسلہ ہے۔

لوگ اسے برداشت کرتے ہیں وہ میزانِ حیات میں اپنا درجہ اونچا کرتے ہیں اور صابرین کے زمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ امتحان اُس سفرِ حیات کے لوازم سے ہے جس میں ہمیں حقیقت کی طرف طَبَقاً عَنْ طَبَقٍ، حالت بہ حالت، آگے بڑھنا ہے۔

ایسی ہی ایک حالت تھی جبکہ حضرت عیسیٰ گیتھسیمنی (Gethsesmane) میں اپنی آخری رات گزارتے ہوئے اپنے روحانی کرب میں یہ پکار اُٹھے تھے "میرے باپ! اگر ممکن ہو تو یہ پیالہ مجھ سے گزر جائے۔ ہاں! میری خواہش کے مطابق نہیں بلکہ تیری مرضی کے مطابق"[۱] یہ وہ الفاظ ہیں جو زمرۂ صابرین میں صرف ایک سلطان ہی کے شایانِ شان ہو سکتے ہیں۔

آخر میں اس موضوع پر سب کچھ کہہ دینے کے بعد کہ جسے تقدیر کہتے ہیں وہ انسانی اعمال کے نتیجہ کی کسی نہ کسی صورت کا نام ہے، یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ خدائے تعالیٰ کیلئے قرآن ایک ایسا میدانِ عمل مختص کر دیتا ہے جس میں انسان کا بہ حیثیت انسان قدم رکھنا ایک فعلِ عبث ہے۔ یہ میدان امرِ الٰہی کا میدان ہے۔ یاد رہے کہ انسان علم و عقل سے کتنا ہی بس کیوں نہ ہو پھر بھی وہ حسبِ منشاء نتائج کی یقین کے ساتھ توقع نہیں رکھ سکتا۔ ایک منزل ایسی آ ہی جاتی ہے جبکہ وہ سب کچھ کر لیتا ہے جو انسان کے بس میں ہے۔ پھر بھی نتیجہ نہ اس کے حسبِ دلخواہ نکلتا ہے اور نہ حسبِ توقع۔ اخلاق اور اخلاقی انصاف کی دنیا میں اصل چیز نیک نیتی ہے۔ وہ خود اپنے لئے اپنے تشفی کا سامان رکھتی ہے۔ یہی ہے حقیقی جزاء، یہی ہے اصل انعام۔ ممکن ہے کہ مادّی حدود میں

اور وہ قانونِ خیر ہے۔ ہاں! خیر ہی خیر ہے۔ یہی ہے اسلام کی روح
اور شاید عیسائیت کی بھی[12]"

قرآن پوچھتا ہے۔

فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

سورۃ التکویر آیۃ (۲۶ تا ۲۹)

پھر تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟ (بلاشبہ) یہ تو دنیا جہان کے لوگوں کے لئے ایک نصیحت ہے تم میں سے ایسے شخص کیلئے جو سیدھی راہ چلنا چاہے اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہ جو اللہ چاہے جو دنیا جہان کا پروردگار ہے

تو پھر سوال یہ ہے کہ انسان کس طرح اپنے ارادے سے وہ ہی چاہے جو اللہ چاہتا ہے۔ یا کس طرح قانونِ عالم سے ہم کنار ہو جائے؟

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۝

تم سب کا پیدا کرنا اور پھر تم سب کا دوبارہ جلانا بس ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کا۔

سورۃ لقمان - آیۃ (۲۸)

ممکن ہے انسان کے نیک اعمال کے نتیجے یہاں دکھائی نہ دیں، لیکن عالم آخرت میں تو یہ شیشے کی طرح صاف نظر آئینگے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ہر ممکنہ کوشش کے ساتھ خدا کی مرضی اور اس کے طریقوں کے مطابق اپنی زندگی، محبت، اعتماد اور امید میں بسر کرے اور باقی خدا پر چھوڑ دے۔

یہ ہے اسلام میں زندگی بسر کرنا۔ کوئی تعجب نہیں گوئٹے Goethe بول اُٹھا تھا "اگر یہی اسلام ہے تو کیا ہم سب اسلامی زندگی بسر نہیں کرتے ہیں؟" اور کارلائل Carlyle نے جو گوئٹے کا ہم نوا تھا اسی آواز کی صدائے بازگشت دی۔

"مجھے کہنے دو کہ صحیح مشرب زندگی یہی ہے۔ انسان اسی حد تک برسرِ حق ہے، ناقابلِ تسخیر ہے، نیک ہے، اور ایک فتح مبین کی راہ پر ہے جس حد تک کہ وہ اپنے سطحی قوانین، عارضی نمود و نمائش اور سود و زیاں کے محاسبات کے باوجود اسی عظیم قانونِ عالم کے مطابق چل رہا ہے اور اس قانون سے مطابقت کرنا اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ وہ اپنی روح کی پوری قوت کے ساتھ یہ جانے اور تسلیم کرے کہ ایسا قانون ضرور موجود ہے

حقیقتاً اپنے ہی ساتھ نیکی کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے کہ ان کی ادائی میں اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی صحت و درستگی کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی اوّلین ذمہ داری یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کو آواز دے کہ وہ اپنی قدرت سے نفسِ بشری میں آبسے اور اسکی سرشت میں رکھے ہوئے توازن کو مناسب طریقے پر استعمال کرنے کی اس کو توفیق عطا فرمائے۔ یہ خیال اُس قرآنی نصیحت کے مطابق ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ

"اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کروگے یا اسکی سنت پر عمل کروگے تو اللہ تمہاری مدد کریگا اور تمہارے قدم مضبوط جمادیگا"

سورۃ محمد۔ آیۃ (۷)

دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ انسان اپنے میں معاشرتی شعور کو ترقی دے، یعنی دوسروں کی فلاح و بہبود کے احساس کو فروغ دے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی اور عمل میں دوسروں کے حقوق تسلیم کرے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد اس طرح واجباتِ نفس اور واجباتِ خلق کے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، بلکہ یہ زندگی کے ایک ہی انداز اور اس سے پیدا ہونیوالے عمل کی دو حیثیتیں یا دو رُخ ہیں، اور یہ اسکی نشان دہی کرتے ہیں کہ انسان کو کس قسم کا ذہن پیدا کرنا ہے۔ یہی ذہن عملِ انسانی کی ذمہ داریاں متعین کرنے میں خاص دخل رکھتا ہے۔ رسول اکرم صلعم کا ارشاد ہے:۔ "اعمال نیتوں پر منحصر ہیں"

باب پنجم

عملِ صالح

اب تک یہ امر واضح ہو چکا ہوگا کہ قرآن کے مطابق حیاتِ انسانی کا مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی میں امن اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کیلئے ایک نظامِ عمل کی صورت میں رونما ہو اور یہ کہ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان اصولوں کے مطابق جو اسکی تہ میں کارفرما ہیں انسان کو اپنے ارادے اور عمل میں ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ اور ہر متنفس کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ :-

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ؕ سورۃ البقرہ آیۃ (۲۸۶) "ہم کسی پر ایسی ذمہ داری عاید نہیں کرتے جو اسکی طاقتِ برداشت سے باہر ہو"

قرآن کے مطابق انسان پر دو قسم کی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو اسکی ذات سے متعلق ہے، اور دوسری وہ جو خارجی دنیا سے متعلق ہے۔ پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے فکر و عمل میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔ جنہیں "حقوق اللہ" کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی انداز کے ساتھ "حقوق العباد" یا حقوق الناس یعنی خارجی دنیا کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے۔ اول الذکر حقوق یعنے حقوق اللہ دراصل اپنے ہی نفس کے حقوق ہیں۔ اللہ کے حقوق کی ادائی

اور اجتماعی زندگی دونوں پر منطبق ہوتا ہے، اور حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں بوقتِ واحد کارفرما ہے۔ "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے مفہوم کے اعتبار سے عمل صالح انسان کیلئے کوئی اور معنی نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ اس فرق کو ہر عملِ حیات میں ضبطِ ذہن رکھا جائے، خواہ اس کا تعلق اپنی ذات سے ہو، یا اپنے ہم جنسوں سے، یا بے زبان جانوروں سے۔ شفقت پاکیزگی، خلوص، عصمت، محبّت، اُنس، سچائی، احترام عہد و پیمان، عفو، دیانت داری، انصاف، رحم، وغیرہ، جیسی ذاتی صفات صرف عشرتی فروع نہیں ہیں جن کو جیسا دل چاہا استعمال کیا گیا۔ بلکہ یہ صالح زندگی کے اجزائے لازمی ہیں۔ ان صفات کے برعکس نفرت، ظلم، ناشائستگی، حرامکاری، بد دیانتی، جھوٹ، فریب، غداری، بے وفائی، کمزوروں پر زیادتیاں جن سے سوسائٹی کا شیرازہ بکھر جائے، نہ صرف برائیاں ہیں بلکہ اسلام میں یہ قطعاً گناہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے سختی کے ساتھ نہ صرف ان سے پرہیز کرنا ہے بلکہ استقلال کے ساتھ ان کا مقابلہ بھی کرنا ہے۔

عملِ صالح کی یہی وہ وسیع تعریف ہے جو قرآن نے پیش کی ہے۔ وہ عملِ صالح جو انسان کو اپنے ساتھ، اپنے ہم جنسوں کے ساتھ، اور دیگر مخلوقاتِ عالم کے ساتھ، امن و سلامتی سے رہنے میں مدد دیتا ہے۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنا عین اسلام ہے۔ جس کے معنی ہی امن و سلامتی ہے۔ یعنی وہ امن و سلامتی جو اپنے جملہ قوائے عمل کو مرضیِ الٰہی سے وابستہ کرنے سے حاصل ہو۔ وہ مرضیِ الٰہی جسکی وضاحت پہلے ہو چکی ہے، سوائے اس قانونِ حیات کے کچھ نہیں ہے جو اسکے

کیونکہ نیت ذہن کا اشاریہ ہے۔ اور عمل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ نیت کی پاکیزگی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ یہ پاکیزگی اس توازن کے صحیح استعمال سے پیدا ہوتی ہے جو انسان میں ودیعت کیا ہے اور جس کا مقصد یہی ہے کہ احساسِ حقوق اللہ و حقوق العباد یا احساسِ واجباتِ نفس و واجباتِ خلق اس طرح ہم آہنگ ہو جائیں کہ انفرادی اور اجتماعی مفاد یا اپنے اغراض اور نوعِ انسانی کے اغراض میں تمیز باقی نہ رہے۔ یہ ہے عملِ صالح۔

تہذیبِ اسلام۔ دراصل اسی راہِ عمل کا نام ہے۔ اس عمل کو بیدار کرنیوالی تلقین رسولِ خدا کی اُس ہدایت سے سمیٹ آتی ہے۔ "اللہ کے طریقوں کی تعظیم کرو اور عیال اللہ سے محبت کے ساتھ پیش آؤ" ذاتی حقوق اور دوسروں کے حقوق یہاں سے پہلو بہ پہلو رکھے گئے ہیں۔ تاکہ انسانی عملِ حیات میں ایک حدت پیدا ہو۔ اپنے خاندان یا اپنی جماعت میں کسی فرد کا مقام کچھ بھی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس دُہری ذمہ داری کا پُورا لحاظ رکھے۔ اس طرح کا لحاظ رکھنا درحقیقت خیر ہے۔ اور اس کا لحاظ نہ رکھنا شر ہے۔ زندگی کے ہر دائرۂ عمل میں خواہ وہ جسمانی ہو یا ذہنی ہو، روحانی، سماجی، یا معاشی ہو۔ یا سیاسی، اس امتیاز کو قائم رکھنا لازمی ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جو حلال و حرام میں فرق کرنیوالے اصول کے اندر کارفرما ہے، اور اس ہدایت کی بھی اساس بنتا ہے جس میں انسان سے کہا گیا ہے کہ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ سورۃ آل عمران۔ آیۃ (۱۰۶) "اچھے کام کی تلقین کرو اور بُرے کام کو روکو" یہ فرق انفرادی

اولو الابصار اور اولوالالباب وغیرہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور جن کے بغیر انسانی زندگی بے کیف ثابت ہوگی۔ جب کبھی کوئی مسلم سچّے دل سے خدا کو آواز دیتا ہے اور کہتا ہے :۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سورۃ فاتحہ۔ آیۃ (۵و۶)

"مجھے وہ سیدھا راستہ دکھا اور اُن صحیح لوگوں کا راستہ جن کو تو نے نعمت عطا کی ہے"

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے تقویٰ اور عمل صالح کی راہ دکھائی جائے، یا اس کی طرف رہبری کیجائے۔ اسلام میں رفیع ترین مقصدِ حیات خواہ کسی فرد کا ہو، یا فرقہ یا قوم کا وہ کوئی مادّی یا سیاسی برتری نہیں ہے جس کے حاصل کرنے کی آرزو تاریخ کے ہر دور میں جاہ طلب افراد کرتے رہے ہیں۔ اس بنیاد پر ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان فرق و امتیاز کے تصوّر ہی کو اسلام نے اپنے پسندیدہ بین الاقوامی تصوّرِ حیات سے یعنی اس تصوّر سے کہ بنی نوع انسان ایک ہی خاندان، ایک ہی گلہ ہے جس کا ہر رکن ایک دوسرے کے لئے گلّہ بان یا رکھوالی ہوگا خارج کر دیا ہے۔ اقوام و ملل کے درمیان برتری کا معیار صرف اجتماعی عمل صالح یا اجتماعی تقویٰ ہی قرار پائیگا۔ چنانچہ رسُول اکرم صلعم نے اپنے اور اپنے پیروؤں کے لئے یہ دعا فرمائی تھی کہ :۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا هَادِيْنَ غَيْرَ ضَالِّيْنَ

بے پایاں خیر کی بدولت اس طرح تشکیل پایا ہے کہ حیاتِ انسانی میں وہ ہم آہنگی پیدا کرے جو کائناتی زندگی میں کارفرما ہے۔ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت کو بھی اس قانون ہم آہنگی کے مطابق بنانے کی سعی کرے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝	"بلاشبہ میری عبادت اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب رب العالمین کیلئے ہیں"

سورۃ الانعام - آیۃ (۱۶۳)

جب زندگی کی یہ صورت ہو جائے تو پھر انسان کا ہر عمل روحانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو عمل صالح کو تمام دوسرے انسانی اعمال سے ممیز کرتا ہے۔ عمل صالح کے اظہار کا دائرہ کچھ بھی ہو، حقوق اللہ یا حقوق العباد، وہ اصل روح جو اسکی تہ میں کارفرما ہے وہ انسان کی دو روحانی صفات یعنی احساسِ رب اور احساسِ خلق کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ روح ہے جو ایک تیسری صفت یا ذہنی صلاحیت کے اظہار کا پس منظر بنتی ہے یعنی اس احساسِ توازن کا جو انسان میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اور نتیجتاً حرکتِ عمل کو وہ خوبی عطا کرتی ہے جسے ہم قرآنی زبان میں تقویٰ کہتے ہیں۔ اسی لئے تقویٰ کی راہ چلنا، یا عمل صالح اختیار کرنا، در اصل اللہ کی سنت یا اسکے قوانین کا احترام کرنے اور "عیال اللہ" پر شفقت و محبت کرنے، یا بقول کارلائل "عظیم قانونِ عالم" سے منسلک ہو جانے، کے مترادف ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جہاں ہر کہ وہ لوگ، مرد اور عورت ملینگے جن کو قرآن صالحین، متقین، صابرین،

لَّا تَغْفِرَهٗ ۝ ۵ تجاوز کرنے سے اور دوسروں کے حدود معینہ سے تجاوز کرنے سے یا ایسی خطاکاری سے جس کو تو معاف کرنا نہ چاہے"۔

میں نے پیغمبر خدا کی چند دعاؤں کو یہاں اس لئے پیش کیا کہ قریب ترین راستے سے میں اُس ذہن تک رسائی حاصل کرسکوں جسے قرآن نے پسند کیا ہے۔ کیونکہ دعا، دعا کرنے والے کے دل کی حقیقی تصویر ہوتی ہے۔ اس سے اسکے ذہنی عمل، اس کے خیالات، احساسات، بلکہ عین مقصدِ حیات کو گہری نظر سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ جب انسان اپنے پروردگار اور اپنے خالق کے روبرو کھڑا ہوتا ہے، تاکہ اس کے سامنے اپنے دل کی بات کھول کر بیان کرے، اور اپنی دنیوی کشمکش، اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کو پیش کرکے ان امور کو طلب کرے جو وہ سمجھتا ہے کہ اس کے لئے ضروری ہیں، تو اس وقت نہ تو کسی قسم کا تصنع ہوتا ہے اور نہ سچائی کے چھپانے اور دبانے کا خیال، نہ شاعرانہ خیالات کی عشرت انگیز نمائش ہوسکتی ہے۔ ایسے لمحات میں اسکی یہ دعا اس کی کسی تڑپتی ہوئی آرزو کا اظہار ہوتی ہے اور اس لئے وہ فطرتاً سادہ اور راست ہوتی ہے۔ یہ اس کے چھلکتے ہوئے جذبات کی آواز ہے، اس کے ذہن کی اس نوعیت کا پتہ دیتی ہے جو اس نے پرورش کی ہے۔

اسلام میں جو دعا بھی تنہائی یا جماعت میں، نماز کے اوقاتِ مقررہ یا کسی اندرونی اقتضا یا پکار کے وقت کیجاتی ہے وہ یا تو الفاظِ قرآنی میں ہوتی ہے یا

وَلَا مُضِلِّيْنَ ۝ ۲۵

"اے اللہ ہمیں زندگی کے راستہ میں دوسروں کے لئے نمونہ بنا
اور ہمیں بھی خود صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما تاکہ نہ خود
گمراہ ہوں اور نہ دوسروں کو گمراہ کریں"

اس قسم کا رُجحان اسی وقت ممکن ہے جبکہ ایک شخص حقوق اللہ کے احساس کو حقوق العباد یا حقوق النّاس کے احساس کے ساتھ مربوط کردے۔ یہ وہ رُجحان ہے جس کے نشوونما کے لئے رسول اکرم صلعم نے خدا سے مدد مانگنے کی اس طرح تبلیغ فرمائی ہے :-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَزِلَّ اَوْ اُزَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْهَلَ اَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ ۝ ۲۶

"اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں دوسروں کو گمراہ کرنے سے اور خود گمراہ ہونے سے، دوسروں کو ذلیل کرنے سے اور خود ذلیل کئے جانے سے، دوسروں پر ظلم کرنے سے اور خود پر ظلم کئے جانے سے، دوسروں کو جہالت میں مبتلا کرنے سے اور خود جہالت میں مبتلا کئے جانے سے"

اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَعْتَدِيَ اَوْ يُعْتَدٰى عَلَيَّ اَوْ اَكْسِبَ خَطِيْئَةً اَوْ ذَنْبًا

"اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں دوسروں کو مضرت پہنچانے سے اور اس مضرت سے جو دوسرے مجھے پہنچائیں اور خود حدود معینہ سے

حسبِ ذیل دعاؤں کی نوعیت پر غور کیجیے جو مسلمان کی پابندی کے ساتھ روزانہ پڑھی جانے والی نمازوں میں داخل ہوگئی ہیں یا اس کا جزء لاینفک بن گئی ہیں۔ ایک وہ عام دعا ہے جس سے ہر نماز شروع ہوتی ہے اور دوسری وہ ہے جو اسکی نمازِ شب میں داخل کی گئی ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ آمِيْن۔ سورۃ فاتحہ۔ آیۃ (۱ تا ۷)

سب تعریف اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے جو بڑا ہی مہربان اور نہایت رحم والا ہے جو روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمکو سیدھی راہ دکھا، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا نہ راہ ان لوگوں کی جن پر غضب کیا گیا اور نہ ان کی جو گمراہ ہوئے۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْ مَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا اَعْطَيْتَ وَقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ اِنَّهٗ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ

رسول اللہ کے ان الفاظ میں جو احادیث میں محفوظ ہیں۔ اگر دعا کرنیوالا بے ساختگی سے اپنی ہی زبان استعمال کرتا ہے تب بھی اس کا ماخذ قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔ اپنے مالکِ حقیقی کی طرف وہی رجحان، جن الفاظ کو وہ استعمال کرتا ہے ان کے پیچھے وہی تصور اور ان سے پیدا کی ہوئی وہی روحانی فضاء اس کے دل میں تازہ ہو جاتی ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس پر قرآنی تعلیم حاوی نہ ہو یا جو رسول اللہ کے عمل میں نہ پائی جاتی ہو۔

آنحضرتؐ نے ایک بار یہ دعا فرمائی کہ "اے اللہ اسلام کو میرے لئے بہت خوشگوار بنا دے" یہ ایک مختصر سی دعا ہے۔ مگر کتنی جامع ہے۔ دعا کرنیوالا یہاں یہ خواہش کرتا ہے کہ اسلام کا راستہ اس کے لئے خوشگوار بنا دیا جائے۔ اسلام کا وہ راستہ جو عبادت کا راستہ ہے یعنی ہر برائی کے خلاف جہاد کرنے کا راستہ، اپنی مرضی کو مرضی الٰہی کے مطابق کرنے کا راستہ، اور اپنی جملہ صلاحیتوں کو زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کیلئے وقف کرنے کا راستہ۔ وہ ایسی زندگی طلب کرتا ہے جسکی تربیت سنت اللہ کی فضا میں ہوئی ہو۔ یعنی اس قانون کے مطابق جو سکونِ قلب کیلئے ہماری فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ وہ فرض ہے جسکی ادائی میں بہت کم لوگ ایسے ملینگے جو یہ دعویٰ کر سکیں کہ وہ کبھی متزلزل نہیں ہوئے پھر بھی ایک سچے مسلمان کو یہ دعا کرنی ہی ہے کہ ایسی کٹھن منزل بھی اس کے لئے خوشگوار بنا دی جائے۔

یہ وہ منزل ہے جسکی طرف ہر اسلامی دعا کا رُخ کرنے کی ہدایت ہے۔

مِنْ كُلِّ بِرٍّ ۞

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَاَسْاَلُكَ عَزِیْمَةَ الرُّشْدِ وَاَسْاَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَاَسْاَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا وَقَلْبًا سَلِیْمًا وَخُلُقًا مُسْتَقِیْمًا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَاَسْاَلُكَ مِنْ خَیْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ مِمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۞

اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے وہ (اوصاف) جن سے تیری رحمت واجب اور تیری مغفرت لازم ہو جاتی ہے اور مانگتا ہوں تجھ سے ہر گناہ سے بچاؤ اور ہر بھلائی کا فائدہ۔

اے اللہ مانگتا ہوں میں تجھ سے ہر امر میں ثابت قدمی، مانگتا ہوں میں تجھ سے سیدھے پن اور نیکوکاری کا ارادہ اور مانگتا ہوں میں تجھ سے تیری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی اور اچھے طور پر تیری عبادت بجالانے کی توفیق، مانگتا ہوں میں تجھ سے سچ بولنے والی زبان، پاک دل اور سیدھی طبیعت اور پناہ مانگتا ہوں میں تجھ سے ہر اُس شر سے جس کو تو جانتا ہے اور مانگتا ہوں میں تجھ سے ہر وہ بھلائی جو تیرے علم میں ہے اور مغفرت چاہتا ہوں ہر اس گناہ سے جسکو تو جانتا ہے۔

تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ ۝

اے اللہ ہدایت دے مجھے تاکہ ہو جاؤں میں منجملہ ان کے جن کو تونے ہدایت دی ہے اور محفوظ رکھ مجھے منجملہ ان کے جن کو تونے محفوظ رکھا ہے اور دوست بنا مجھے منجملہ ان کے جن کو تونے دوست بنایا ہے اور برکت دے مجھے اس میں جو تونے مجھے عطا فرمایا ہے اور بچا مجھے شر سے اس کے جس کا تونے حکم دیا ہے بیشک۔ تو ہی حکم کا صادر کرنے والا ہے اور تجھ پر کوئی حکم صادر نہیں کیا جا سکتا۔ بیشک وہ جس کو تو دوست رکھے کبھی ذلیل نہیں ہوتا۔ اے ہمارے پروردگار تو نہایت ہی بڑا ہے اور بزرگ و برتر۔

یہ دعا جو ہر روز کئی مرتبہ دُہرائی جاتی ہے مسلمان کو اُس زندگی کی خصوصیت بار بار یاد دلاتی ہے جس کی اسے پابندی کرنی ہے۔ یعنی وہ زندگی جو عملِ صالح پر مبنی ہے۔ اسکی شام کی دعا میں بھی یہی آواز گونجتی ہے۔

واضح باد کہ ہر اسلامی دعا اپنی جگہ ایک عزم یا تہیہ ہے "سنت اللہ" سے مطابقت پیدا کرنے اور امداد الٰہی حاصل کرنے کا۔ تاکہ انسان اپنے واجباتِ نفس اور اس کے ساتھ واجباتِ خلق یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بخوبی تکمیل کر سکے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَالْعِصْمَةَ

یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اس کی اصل ضرورت ایک پاکیزہ زندگی حاصل کرنا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ لَذَّۃَ النَّظَرِ اِلٰی وَجْھِکَ وَشَوْقًا اِلٰی لِقَائِکَ فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّۃٍ وَّلَا فِتْنَۃٍ مُضِلَّۃٍ۔[11]

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ عِیْشَۃً نَقِیَّۃً وَمِیْتَۃً سَوِیَّۃً وَمَرَدًّا غَیْرَ مُخْزٍ وَّلَا فَاضِحٍ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ۔[12]

اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے تیری لذتِ دید اور تیرا شوقِ ملاقات بغیر کسی ایسی تنگی کے جو مضرت رساں ہو اور بغیر کسی ایسے فتنہ کے جو گمراہ کن ہو۔

اے اللہ مانگتا ہوں میں تجھ سے پاک زندگی، اچھی موت اور ایسا لوٹنا جو نہ رسوا کرنے والا ہو اور نہ شرمندہ کرنے والا۔

اُوپر پیش کی ہوئی دعاؤں اور دیگر دعاؤں سے جو قرآن و حدیث میں درج ہیں ایک ایسے ذہن کی بے قراری کا پتہ چلتا ہے جس کا ہر عمل ایک طرف دل کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے احساسِ رب سے ہدایت پا رہا ہے تو دوسری طرف اسی قوت کے ساتھ اپنے زندگی کے متعینہ زمہ داریوں کے احساس سے بھی متاثر ہے تاکہ وہ آخرت میں اپنی موجودہ زندگی کے اعمال کا فردِ حساب اطمینان

بیشک تو تمام پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہے۔

اس دعا کی روح پر بھی غور فرمائیے۔

اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الَّذِیْ ھُوَ عِصْمَۃُ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ دُنْیَایَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَاشِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ اٰخِرَتِیَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَادِیْ وَاَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیٰوۃُ خَیْرًا لِّیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِّیْ وَاجْعَلِ الْحَیٰوۃَ زِیَادَۃً لِّیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَۃً لِّیْ مِنْ کُلِّ شَرٍّ

اے اللہ سدھار دے تو میرے لئے میرے دین کو کہ وہ میرے ہر امر کا بچاؤ ہے اور سدھار دے میرے لئے میری دنیا کو کہ اس میں میری زندگی ہے اور سدھار دے میرے لئے میری آخرت کو کہ اس طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے اور مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک کہ زندگی میرے لئے اچھی ہے اور مجھے موت دے جبکہ موت میرے لئے اچھی ہو اور زندگی کو میرے لئے ہر نیکی میں زیادتی کا باعث بنا اور موت کو میرے لئے ہر برائی کے مقابلہ میں موجب آرام کر۔

اس طرح انسان کیلئے موت کوئی خوفناک چیز نہیں ہو سکتی۔ جس چیز سے حقیقتاً انسان کو خوف کرنا ہے وہ برائیوں کی زندگی ہے۔ اور لازم ہے کہ اسی کیلئے انسان اللہ کی حفظ و امان تلاش کرے۔ انسان کو چاہیے کچھ بھی طلب کرے

باب ششم

حیاتِ مابعد

کسی نہ کسی صورت میں حیات بعد الموت پر اعتماد کم و بیش ہر مذہب میں پایا جاتا ہے وہ زندگی درحقیقت کیا ہے اسی وقت معلوم ہو سکیگی جب کوئی اس میں داخل ہو۔ وہ ہرگز حیاتِ ارضی کی طرف واپس آنا یعنے پھر گوشت پوست میں از سرِ نو جنم لینا نہیں ہے۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے حیاتِ انسان ایک پھر ہوا لا چکر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خطِ مستقیم ہے اور اسے ہر وقت ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہونا ہے۔ آنیوالی زندگی کی تصویر جو روایات کی صورت میں حدیثی ادب میں داخل ہو گئی ہے اور قرونِ وسطیٰ کے دل و دماغ رکھنے والے مسلمانوں کیلئے بڑی دلکش رہی ہے، چند صورتوں کے سوائے قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔ قرآنی طرزِ بیان یہ ہے کہ صرف اسکی ایک جھلک دکھائی جائے اور وہ بھی اُن پیرایوں میں جنکو امثال، تشبیہ اور استعارہ کہا جاتا ہے اور جن کا منشا ایمائی اور اشارتی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس پار کی زندگی ایسی ہے کہ انسان اپنے موجودہ ماحول میں رہکر بمشکل اس کا ادراک کر سکتا ہے یا اسے سمجھ سکتا ہے۔ [۲]

امثال اور تشبیہات کے ذریعہ جو منظر پیش کیا جاتا ہے اس کا مقصد

کے ساتھ پیش کر سکے۔

اس لئے اس حیاتِ اُخروی کے خیال کو جو قرآنی الفاظ میں "حقیقی زندگی" ہے[۱۳] ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ حال کی زندگی اس کے لئے ایک زادِ راہ قرار پائے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے آنے والی زندگی کو یقینِ محکم کی سطح تک بلند کر دیا ہے اور اُسے حیاتِ انسانی کیلئے اتنا ہی اہم قرار دیا ہے جتنا کوئی اور یقینِ محکم ہے جس کا اظہار عملِ صالح کے ذریعہ ہو سکے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝

اور تمکو کیا خبر کہ حطمہ کیا چیز ہے۔ "وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک جا پہنچے گی"

سورۃ الھمزہ۔ آیۃ (۵ تا ۷)

اس آیت میں جہنم کی مثال اُس قلب سے دیگئی ہے جو روحانی کرب میں مبتلا ہو۔ جنّت و دوزخ کی دو تصویریں جو قرآن مثالوں کے ذریعہ پیش کرتا ہے روح انسان کی دو مختلف حالتیں ہیں جو ایک ایسے ماحول میں تشکیل پائینگے جو ہماری موجودہ زندگی کی فضاء سے مختلف ہے۔ امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں آل عمران۔ آیت (۱۳۳) سے متعلق رسول اکرم کی یہ ایک گفتگو نقل کی ہے جو شاہِ ہرقل کے قاصد سے ہوئی تھی۔ آیت یہ ہے:۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

اور اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف لپکو (دوڑو) اور جنّت کی طرف، جو زمین و آسمان کی وسعت رکھتی ہے (دوڑو) اور جو پرہیزگاروں کیلئے تیار ہے۔

رومی قاصد نے دریافت کیا کہ اگر جنّت سارے آسمان و زمین پر حاوی ہوگی تو پھر دوزخ کیلئے جگہ کہاں ہوگی۔ رسول اکرم نے آہستگی سے استفسار کی صورت میں جواب دیا۔ "بزرگی خدائے تعالیٰ کیلئے ہے۔ جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے"؟ اس بلیغ جواب سے ہمارے پیش کردہ نظریہ پر مزید

یہ ہے کہ صاحب بصیرت اور کم مواد اِن دونوں کی عقل وفہم کو تشفی ہوسکے نیک لوگ ایک امن کی زندگی بسر کرینگے اور غلط کار بے چینی کی۔ یہ ہے وہ تاثر جو ان کے ذریعہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اِن تمثیلوں کا ہماری زندگی سے ماخوذ ہونا ان کے قابلِ فہم ہونے کیلئے ضروری ہے۔ اس لئے حیاتِ مابعد کا مرقع اُسی انداز سے کھینچا گیا ہے اور سمجھایا گیا ہے کہ جنّت ایسی آرامگاہ ہوگی جہاں باغ ہونگے جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں۔ دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور جہاں خوشگوار صحبتیں ملتی ہیں وغیرہ۔ مگر فوراً اس احتمال کو رفع کیا جاتا ہے کہ جنت کے باغ بالکل دنیوی باغوں کی طرح نہیں ہیں، بلکہ یہ واضح کر دیا جاتا ہے کہ وہ اِس دنیا سے مختلف ہیں۔ وہاں کے ثمر موسموں کے محتاج نہیں ہیں، دریا کا پانی گندہ نہیں ہوتا۔ اس کا ذائقہ بھی جدا ہے، وہاں کے ساتھی بیکیفی کی میں نہ ہونگے بلکہ ایک مُطہّر ہیئت لئے ہوئے ہونگے اور انہیں نہ ضعیفی آئیگی نہ وہ فضول گفتگو کریں گے۔ اس سارے منظر کو ایک حدیثِ قدسی میں سمیٹ لیا گیا ہے جس میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ اِن امثال سے وہاں کی حقیقت کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آسکتی۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنے نیک بندوں کیلئے اُس نے ایک ایسی چیز تیار کی ہے جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا، اور کسی انسانی دماغ نے نہیں سوچا۔" اسی طرح وہ امثال بھی جو جہنّم کی زندگی سے متعلق ہیں جسمانی تکالیف کی واردات سے ماخوذ ہیں اور ان کا منشاء خطاکاروں کی اس زندگی کی ایک مثال پیش کرنا ہے جس میں وہ اپنے آپکو نئے ماحول میں پائینگے۔ قرآن نے خود اس کی صراحت کر دی ہے۔ قرآن پوچھتا ہے، خود جواب فراہم کرتا ہے۔

مومنان در حشر گویند اے ملک — نی کہ دوزخ بود راہ مشترک
۲۵۵۵ مومن و کافر برو یابد گزار — ماندیم اندرین او دو دو نار
نک بہشت و بارگاہِ ایمنی — پس کجا بود آن گزرگاہ دنی
پس ملک گوید کہ آن روضۂ خضر — کہ فلان جا دیدہ اید اندر گزر
دوزخ آن بود سیاستگاہ سخت — بر شما شد باغ و بستان و درخت
چون شما این نفس دوزخ خوی را — آتشی گبر فتنہ جوئے را
۲۵۶۰ جہد ہا کردید و اوشد برصفا — نار را کشتید از بہر خدا
آتش شہوت کہ شعلہ می زدی — سبزہ تقوی شد و نور ہدی
آتش خشم از شما ہم حلم شد — ظلمت جہل از شما ہم علم شد
آتش حرص از شما ایثار شد — وآن حسد چون خار بد گلزار شد
چون شما این جملہ آتشہای خویش — بہر حق کشتید جملہ پیش پیش
۲۵۶۵ نفس ناری را چو باغی ساختید — اندرو تخم وفا انداختید
بلبلان ذکر و تسبیح اندرو — خوش سرایان در جمین ہر طرف جو
داعی حق را اجابت کردہ اید — در جحیم نفس آب آوردہ اید

دوزخ ما نیز در حق شما
سبزہ گشت و گلشن و برگ و نوا

جہنم اور جنت کی ماہیت کچھ بھی ہو اس کا اعتراف تو کرنا ہوگا کہ شیت ایزدی کی تکمیل میں دونوں مقامات کی زندگی اس مقصدِ حیات کی تکمیل کا ذریعہ بنی ہے جو

روشنی پڑتی ہے۔

ایک اور طریقہ سے اس نظریہ پر غور کیجئے۔ قرآن کے بموجب ہر شخص کو دوزخ سے گزرنا ہے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝	اور تم میں سے کوئی نہیں جسکا اس پر سے گزر نہو۔ اس بات کا تمہارے رب نے حتمی طور پر فیصلہ کردیا ہے۔

سورۃ مریم۔ آیۃ (۷۱)

چند قدیم طرز کے مفسرین کا یہ خیال ہے کہ اس آیت میں ایک پُل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو دوزخ پر ہے اور جس پر سے ایک روایت کے مطابق ہر شخص کو روزِ قیامت ہو کر گزرنا پڑیگا۔ ۹

یہ خیال عجیب طریقے سے اُس خیال کے متوازی ہے جو خاص کر قدیم زرتشتیوں میں رائج تھا۔ قرآن میں تو اس قسم کے پل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے تو دیکھنا یہ ہے کہ جس حدیث میں پل صراط کا ذکر آیا ہے خود اسی میں اس استدلال کی بھی تائید موجود ہے کہ دوزخ اور جنّت حیات مابعد میں روح کی دو حالتوں کا نام ہے۔ اہلِ ایمان سے دوزخ پکار کر کہیگی۔ "اے ایمان والے اس پُل پر سے گزر جا کیونکہ تیرے نور نے میری آگ بجھا دی ہے۔"

مولانا جلال الدین رومی نے جو شاعر بھی ہیں اور صوفی بھی ہیں اپنی مثنوی جلد دوم کے صفحہ ۴۸۸ اشعار (۲۵۵۴ تا ۲۵۶۸) میں اس مسئلہ کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ :—

اَلْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝	ہم اسے کتاب کی شکل میں اس کے واسطے
اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ	نکال کر سامنے کر دینگے وہ کھلا ہوا پائیگا
الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝	(اور کہا جائیگا کہ) اپنا نامۂ اعمال پڑھ
سورۃ بنی اسرائیل - آیۃ (۱۳ تا ۱۴)	آج تو اپنے اعمال کے حساب کیلئے خود ہی کافی ہے۔

اِس نئی منزلِ حیات کے مخصوص طریقوں کے مطابق ہر شخص کو اپنی اُس زندگی کے حُسن و قُبح کا مشاہدہ کرنا ہوگا جو اُس نے عہدِ گزشتہ میں بسر کی تھی، لیکن جسے کج فہمی اور اللہ کی نشانیوں سے عمداً رُوگردانی کے باعث بطورِ خود دیکھنے سے انکار کیا تھا، حالانکہ اس کے پاس وقت بھی تھا، اور موقع بھی تھا کہ وہ توبہ و استغفار کرے۔ نیز وہ اس "توازن کی مدد سے جو اس کی سرشت میں ودیعت تھا" کفارۂ ماضی بھی کر سکتا تھا۔ موت کے بعد کی منزل میں اس کی حیاتِ ماضی کے حُسن و قُبح اس کے روبرو پیش کئے جائینگے اور ایسی ہیئت میں پیش کئے جائینگے جنہیں اپنی نئی تشکیلِ حیات میں وہ یا تو خوشی کے ساتھ مشاہدہ کریگا یا بے بسی اور کرب کے عالم میں دیکھے گا۔

قرآنی نقطۂ نظر سے حیاتِ احسن یہ ہے کہ تکمیل کی منزل کی طرف بڑھتے ہی چلے جائیں۔ اسی طرح حیاتِ قبیح کو پہلے پہل ایک خاص طریقۂ تطہیر سے گزرنا ہوگا۔ اول الذکر کیلئے راستہ صاف ہے اور دوسری کیلئے اپنی کیفیاتِ نفسی کے مزاحمات کو سر کرنا ہوگا۔ موقفِ اول کو "قُرب" اور موقفِ ثانی کو "بُعد" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ "بُعد" اس کی دنیوی خطا کار زندگی کا ایک عکس ہے یعنی

اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر ہے اور جس میں خود انسان تخلیقی ارتقاء کی ایک اہم منزل قرار پاتا ہے کیونکہ یہ امر واضح ہے کہ دوزخ اور جنّت خواہ وہ روح کی حالتیں ہوں یا کچھ اور، ہمیشہ ایک ہی حالت پر قائم نہیں رہ سکتے۔ اس سے مقصدِ تخلیق میں ایک جمود پیدا ہوگا، اور منشاءِ تخلیق برہم ہو جائیگا۔ قرآن نے خاص احتیاط سے اس مقصد کی وضاحت کی ہے:-

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ — تمہیں ایک (منازل ہستی کو) درجہ بدرجہ (ایک پست حالت سے ارفع حالت کی طرف) مسلسل یقیناً لے جایا جائیگا۔

سورۃ الانشقاق - آیۃ (۱۹)

یہ وہ وعدہ ہے جو نیک اور بد دونوں سے ایکساں طور پر کیا گیا ہے تو اس وعدے کا ایفا کس طرح ہوتا ہے؟

قرآن بار بار اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ دنیا کا نیک اور بد دونوں قسم کا انسان زندگی کی دوسری منزل کیلئے اپنے دنیوی اعمال کے اثرات اپنے ساتھ لیجائیگا جو اس کی روح پر ناقابلِ محو طریقہ سے مرتسم ہونگے۔ اس کا عمل، اسکا خیال، اسکی گفتگو، اس کا احساس، اور اس کا تصوّر۔ یہی نہیں بلکہ اسکی خوش فہمیاں اور توہمات بھی، اسکی گردن سے مضبوطی کے ساتھ چپٹے ہوئے رہینگے اور اس زندگی کی نشان دہی کرینگے جو اس نے اس دنیا میں بسر کی تھی۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ — اور ہم نے ہر شخص کے نامۂ اعمال کو اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور قیامت کے دن

ہوگی اور عملِ بد سے احساسِ تنزل پیدا ہوگا۔ اگر انسان اپنی موت سے قبل اپنے اعمال کی بدصورتی محسوس کرلے، اور تہ دل سے توبہ و استغفار کرلے، اور نیکی کی طرف لوٹ آئے، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اسے اطمینانِ قلب عطا کرنے کیلئے ہمیشہ موجود ہے۔

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ سورۃ السجدۃ۔ آیۃ (۲۱)

اور ہم لازمی طور پر اس بڑے عذاب کے آنے سے پہلے دنیا کے چھوٹے عذاب کا مزہ بھی چکھائیں گے۔ ممکن ہے یہ لوٹ آئیں۔

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ۝

سورۃ الشوریٰ۔ آیۃ (۲۵)

اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور خطائیں بخش دیتا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اُسے جانتا ہے۔

یہی وہ طریقہ ہے دوزخ سے گزرنے یا ناپاکیوں کو جلا ڈالنے کا جس سے انسان پاک ہوکر جنت میں داخل ہونے کے قابل بن سکے۔ گناہوں کی بدصورتی کو محسوس کرنا فطرتاً تکلیف دہ چیز ہے۔ وہ ایک ذہنی یا روحانی کرب کی کیفیت ہے جو قرآنی زبان میں "جہنم کی آگ" کہلاتی ہے۔ تطہیر کا یہ راستہ عادتی گناہ گاروں ہی کیلئے ضروری نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کیلئے بھی ضروری ہے جو عادتاً نیک تو ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی جادۂ تقویٰ سے ہٹ جاتے ہیں، کیونکہ کوئی انسان خطا سے

وہ دوری جو اس نے دنیوی زندگی میں اُلجھ کر خدائے تعالیٰ سے اختیار کی تھی۔

وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ۝ سورۃ بنی اسرائیل۔ آیۃ (۷۲)

اور جو اس دنیا میں اندھا رہا۔ سو وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہیگا اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔

اس طرح یہ دوری جو "وجہ اللہ" یعنی دیدارِ الٰہی سے نتیجۃً پیدا ہوگی انسانی روح کیلئے بہت تلخ رہیگی۔ قرآنی الفاظ میں وہ اس کیلئے جہنم رہے گی جس طرح کہ نیک انسان کیلئے جنت رہیگی۔ چنانچہ ایک مومن کی پُرخلوص یہ دعا ہوتی ہے:

اللھم انی اسئالك لذة النظر الیٰ وجھك وشوقاً الیٰ لقائك فی غیر ضراء مضرة ولا فتنة مضلة ۔ سلا

اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے تیری لذتِ دیدار اور تیرا شوقِ ملاقات بغیر کسی ایسی تنگی کے جو مضرت رساں ہو اور بغیر کسی ایسے فتنہ کے جو گمراہ کن ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قرآنی مفہوم میں دوزخ و جنت کی ابتدا انسان کی دنیوی زندگی ہی سے شروع ہو جاتی ہے، کیونکہ جو کچھ بھی نیک و بد عمل وہ یہاں کرتا ہے وہ فوراً اُس کا جزءِ حیات بن جاتا ہے، اور نتیجتاً اسے ملنے والی دوزخ یا جنت کا قبل از قبل مزہ چکھنے لگتا ہے۔ نیک عمل سے روحانی رفعت

رکھ سکیں۔

"تمہیں ایک پست حالت سے ارفع حالت کی طرف مسلسل یقیناً لے جایا جائیگا"

یہ ہے وہ منصوبۂ حیات جو قرآن کے پیشِ نظر ہے۔ "حیاتِ جمیل" کو عالمِ بالا آگے بڑھایا جائیگا تا آنکہ وہ منزلِ تکمیل کو پہنچ کر خدا کا عین دیدار دیکھ سکیگی۔ اس کے برعکس "حیاتِ بد" فطرتاً پیچھے رہ جائیگی اور اس سے قبل کہ وہ آزاد حرکت کی زندگی میں داخل ہو اسے ایک تنگ راہ سے گزرنا پڑیگا۔ یہ عملِ تطہیر کب تک جاری رہیگا اُس کا انحصار خدا کی مرضی پر ہے "لفظ ابداً" جس کا مفہوم یہودی اور عیسائی تصوّرات کے تحت "ہمیشہ ہمیشہ" لیا گیا ہے۔ قرآنی مفہوم کے مطابق صرف وہ وقفہ مراد ہے جو پاک ہونے کے لئے درکار ہے اور جسے خداوند تعالیٰ نے خود اپنے احساسِ زمان اور اقدارِ اشیاء کے مطابق مقرر فرمایا ہے۔ ورنہ ہمیں ایک قسم کی "ثنویت" یا "کثرتِ ہستی" سے دوچار ہونا پڑیگا جو خدا کے برابر ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے کی صفت کا ادّعا کر سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال قرآنی تصوّرِ "توحید" کے منافی اور قرآن کے اس اعلان کے مغائر ہوگا جس میں کہا گیا ہے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ "جملہ اشیاء ایک دن فنا ہو جائینگے" جس میں انسان، جہنّم، اور جنّت ہر ایک شامل ہے۔

گناہوں سے پاک ہونے کی حقیقی صورت کے متعلق قرآن میں جو لفظ "ابدا" استعمال ہوا ہے اس کے مفہوم کی وضاحت جو ابھی پیش کی گئی ہے بہت صاف طور پر اُن الفاظ سے ہو جاتی ہے جو خود قرآن نے سورۃ النبا۔ آیۃ (۲۲ و ۲۳) میں

عاری نہیں ہے۔ یہ نیک لوگ تکمیل کی طرف بڑھنے کی آزادی کا لطف اٹھانے کیلئے ہر طرح سے تیار رہینگے، لیکن انہیں اپنے اس کوچ سے قبل ہر اس مزاحمت کو دور کر دینا ہوگا جو ان کی ترقی میں حائل ہو۔ قرآنی تشبیہ کے مطابق انہیں بھی جنّت میں داخل ہونے سے پہلے دوزخ سے گزرنا ہوگا۔[۱۲] جو حقیقی نیک بندے ہوتے ہیں وہ اپنی ہر اس غلطی کی ماہیت کا تکلیف دہ اندازہ کرکے جو اُن کی دنیوی زندگی میں اُن سے سرزد ہوئی ہے اس دنیا ہی میں اپنا یہ کام پورا کر لیتے ہیں۔ یہ طریقہ موت سے پہلے وقت پر توبہ و استغفار کر لینے اور روحانی طہارت حاصل کرنے کا ہے۔ ان ہی کیلئے قرآن کا یہ خطاب ہوگا۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ سورۃ الفجر۔ آیۃ (۲۷ تا ۳۰)	اے وہ روح جو آرام سے ہے اپنے پروردگار کی طرف واپس آ۔ خوش ہو کر اور خوش کرتے ہوئے۔ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

اُنہیں پاک ہونے کے لئے اس تطہیر کی چکّی سے گزرنے کی مزید کوئی ضرورت لاحق نہ ہوگی کیونکہ وہ اپنی دنیوی زندگی ہی میں اس سے گزر چکے ہیں۔ البتہ یہ طریقہ اُن لوگوں کا انتظار کریگا جنہوں نے "توبہ" کے عمداً مواقع کھو دئے حالانکہ ان کے پاس وقت تھا۔ یہی وہ لوگ ہونگے جو زندگی کی دوسری منزل میں امتحان سے گزرنے کے یا ایک حدیث شریف کے مطابق جنت میں داخل ہونے سے قبل آگ سے پاک کر دئے جائینگے۔[۱۳] تاکہ منزلِ تکمیل کی طرف وہ اپنا کوچ جاری

تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں، لیکن دوزخ کی زندگی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ خطاکار اس وقت تک اس میں رہینگے جب تک کہ زمین اور آسمان قائم ہیں اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سوائے اس کے کہ تمہارا پروردگار اس کے برعکس کچھ اور چاہے، بیشک تمہارا پروردگار وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے، یہ بھی غور کیجئے کہ خود دوزخ کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہیگی کیونکہ یہ زمین و آسمان کے بعد جو ایک دن فنا ہو جائیں گے برقرار نہیں رہ سکتی۔ اُوپر کی آیت پر بھی غور کیجئے۔ "اِلَّا اس کے کہ تمہارا پروردگار اس کے برعکس کچھ اور چاہے" اور باب چہارم میں "مشیتِ الٰہی" کی شرح کی روشنی میں اس پر نظر ڈالئے تو واضح ہوتا ہے کہ دوزخ کی زندگی انسان کیلئے اتنی ہی مدت کیلئے ہوگی جتنی کہ گناہوں سے پاک کرنے کے لئے درکار ہے۔ یہ حقیقت ذیل کی آیتِ قرآنی سے بھی واضح ہوتی ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ	جو شخص نیک عمل کریگا اسکو اس کی دس
اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ	نیکیاں ملیں گی۔ اور جو بدی کا ارتکاب
فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ	کریگا تو اسکو اُسی قدر سزا دی جائیگی اور
لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ سورۃ الانعام۔ آیۃ (۱۶۱)	ان لوگوں پر مطلق ظلم نہ ہوگا۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دوزخ میں کسی گناہ کے مواخذے کیلئے جو بھی آزمائش ہوگی اسکی ایک حد مقرر ہے کیونکہ گناہ کی نوعیت کے مطابق جو حد ہو سکتی ہے اس سے متجاوز ہونا یا ہمیشہ کی سزا دینا ظلم ہے۔ اور آیت متذکرہ میں یہ دعویٰ ہے کہ کسی پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔ پھر قرآن اس کا بھی اضافہ کرتا ہے

استعمال کئے ہیں :۔ لِلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا ۝ لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا ۝ (وہی سرکشوں کا ٹھکانا (ہے) کہ اسی میں قرنوں رہینگے" ان آیات میں دوزخ کو گناہ گاروں کا ٹھکانہ قرار دیا گیا ہے جہاں وہ ایک مدت کیلئے رہیں گے۔ یہاں "احقاب" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو "حقب" کی جمع ہے۔ اس کے معنی ایک وقفہ کے ہیں جو ایک سال سے اسّی سال کے درمیان ہو جس سے مجملاً ایک طویل عرصہ مراد ہے۔ اسی طرح سورۃ ہود میں (۱۰۷ و ۱۰۸) کی آیتیں جہنم کی زندگی کا دوام نہیں جاہتیں۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝
وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ۝

"(بدبخت) جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہمیشہ اسی میں رہینگے مگر (اے پیغمبر) جسکو تمہارا پروردگار (نجات دینا) چاہے۔ بیشک تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے"

اور جو نیک بخت ہیں تو وہ بہشت میں ہونگے اور جب تک آسمان و زمین قائم ہیں برابر اسی میں رہینگے مگر جس کو خدا چاہے۔ یہ عطائے ربانی ہے جس کا خاتمہ نہیں۔

اِس مقام پر کہا گیا ہے کہ نیک لوگ جنّت میں رہیں گے اس وقت

اُس وقت شفاعت کرسکتے تھے، لیکن ان میں سے اب ایک بھی تیار نہیں ہے سوائے ارحم الراحمین کے۔ اس لئے نار جہنم میں سے ایک مٹھی نکالیگا اور ایسے اشخاص کو باہر کھینچ لیگا جنہوں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی تھی"

(مسلم کتاب الجنۃ وصفاتہ)

کنزل العمال میں دو حدیثیں نقل ہوئی ہیں۔

"یقیناً دوزخ پر ایک ایسا دن آئیگا جبکہ وہ ایک ایسی کھیتی جیسی ہوجائیگی جو ایک مدت تک شاداب رہنے کے بعد سوکھ گئی ہو" "یقیناً دوزخ پر ایک دن ایسا بھی آئیگا جبکہ اس میں ایک انسان بھی باقی نہیں رہیگا"

(ص ۲۴۵ مطبوعہ دائرۃ المعارف) حیدرآباد دکن

صحاح میں حسب ذیل حدیث مرقوم ہے:۔

"جب اہل دوزخ پر کچھ مدت گزر جائیگی اس وقت خدائے رحمٰن ورحیم اپنا ایک پاؤں اس پر رکھے گا اور دوزخ پارہ پارہ ہوکر غائب ہوجائیگی"

(مسلم کتاب الجنۃ وصفاتہ)

"دوزخ ہمیشہ ھل من مزید کی آرزومند ہوگی، مگر ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ خدائے بزرگ وبرتر اپنا پاؤں اس میں ڈال دیگا، یہ دیکھنے کیلئے کہ آیا اسے ہنوز سیری ہوئی کہ نہیں۔ دوزخ پکارے گی بس بس میں تیری قدرت اور تیرے رحم کی پناہ مانگتی ہوں اور وہ پھر معدوم ہوجائیگی۔ جنت کا ایک وسیع رقبہ ہمیشہ غیر آباد رہیگا۔ اللہ اسے

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ	اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔
ذَرَّةٍ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً	اگر (ذرہ برابر کسی نے) نیکی (کی) ہو تو وہ
یُّضٰعِفْهَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ	اُسے دُگنا کر دیگا۔ اور اپنے پاس سے
اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ سورۃ النساء۔ آیۃ (۴۰)	بہت بڑا اجر دیگا۔

اگرچہ قرآن نے گناہ اور اس کے عواقب کی امثالی صورت بہت ہی مہیب بنائی ہے، لیکن گناہ سے متعلق عام قرآنی رجحان ایک افسوس کا ہے جو کامل قوتِ رحم سے متبدل ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تخت پر یہ لکھ دیا ہے "سبقت رحمتی علی غضبی" میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (بخاری کتاب التوحید) خود قرآن اس یزدانی خصوصیت کا اعلان کرتا ہے:۔

"میرا رحم ہر شئے پر محیط ہے"

اس سے دوزخ کی ابدیت کی بحث کا ازالہ ہو جانا چاہیئے جس کی قوی حمایت مفسرین آج بھی فرماتے ہیں۔ اس نظریہ کی تائید میں چند احادیث پیش کئے جاتے ہیں:۔

مسلمؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں ان اشخاص کا ذکر ہے جن کیلئے قیامت کے دن کوئی شفاعت کے لئے آگے نہیں بڑھیگا اور جن کیلئے اپنے ہی لایزالی رحم وکرم کی بناء پر خود خداوند تعالیٰ شافع کی حیثیت اختیار فرمائیگا۔

"اللہ تعالیٰ اس وقت کہیگا ملائکہ انبیاء اور مومنین گناہ گاروں کی

یہ ہے کہ حیاتِ انسانی سے ہر اُس مزاحمت کو دور کیا جائے جو گناہ کے ذریعہ روحانی ترقی یا پاک زندگی بسر کرنے میں پیش آتی ہے۔ گناہ کی ماہیت کو محسوس کرنا اور تلافی مافات کرنا ایک سخت آزمائشی عمل ہے۔ لیکن بہتر تو یہی ہے کہ عقبیٰ کی بجائے جہاں عالمِ برزخ کی عبوری منزل میں اسے گناہ کی ہیئت کا اندازہ کرنا اور اس کی وجہ سے روح میں جو ناپاکیاں پیدا ہوگئی ہیں اُن کو جلا دینا ہوگا۔ اس دنیا ہی میں یہ منزل طے کرنی چاہیئے۔ تطہیر کا یہ عمل دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک ظہور ہے۔ یہاں ہو یا وہاں جس قدر جلد انسان توبہ کریگا دونوں حالتوں میں اتنا ہی جلد اس کے لئے بخشش کا سویرا ہوگا۔ جہنم میں ہمیشہ کی رہائش اس حکمت اور اس کے سارے مُضمرات کے مخالف پڑجاتی ہے جن کا اشارہ قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اس سے زندگی کے اس قانونِ حیات کی تردید ہوگی جس کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" تمہیں منازلِ ہستی میں درجہ بدرجہ ایک پست حالت سے بہتر حالت کی طرف لیجایا جائیگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کے رحم پر بھی حد بندی عائد ہوگی اور اللہ تعالیٰ کسی قسم کی تحدید قبول کرنے تیار نہیں۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا	اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اُوپر
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ	زیادتیاں کی ہیں اللہ کی رحمت سے مایوس
رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ	نہ ہونا (بیشک) اللہ سب گناہ معاف کرتا

ایک نئے قسم کی مخلوق سے آباد کریگا جو بعد ازاں اُسی میں رہیگی"

(بخاری کتاب التوحید)

اس طریقے کا منشاء یہ ہے کہ اہل دوزخ تطہیر کے ایک عمل کی تکمیل کر کے جنّت میں داخل ہو جائینگے۔

دوزخ کے مسئلہ سے متعلق صحابائے کرام بھی آنحضرتؐ کے اس رجحان سے واقف تھے۔ اس کا ثبوت خلیفہ حضرت عمرؓ کے ایک قول سے ملیگا۔ جو فتح البیان، فتح الباری، دُرِّ منضور اور احادالارواح (مصنفہ ابن قیم) میں درج ہے۔

"اگرچہ اہل دوزخ کی تعداد ریگستان کی ریت کی طرح ناقابل شمار ہوگی لیکن ایک دن ایسا ضرور آئیگا جبکہ یہ اس سے نکال دئے جائیں گے" ۱۶

گناہوں کی زندگی کے متعلق قرآن کی تنبیہہ اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کی تشریح سے جو "کتاب الٰہی" کا ایک جز ہیں ان سے ایک "حکمت" بھی وابستہ ہے۔ یہ حکمت یا مقصد واضح طور پر یہی ہے کہ انسان میں گناہ سے ڈرنے کا گہرا احساس پیدا کیا جائے۔ یہ تشریحات اس لئے ہیں کہ انسان کو گناہ سے باز رکھیں اور اس میں توبہ کا رجحان پیدا کریں اگر وہ آلودۂ گناہ ہو چکا ہو۔ توبہ کا نتیجہ بخشش ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ بار بار مغفرت کیلئے توبہ کرنیوالوں کی طرف رجوع ہونیوالا ہے۔ وہ ان پر کرم فرماتا ہے جو اسکی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسکا منشأ

سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

سورۃ المومنون - آیۃ (۱۲ تا ۱۶)

پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر ایک مضبوط (اور محفوظ) قرار گاہ میں رکھا۔ پھر ہم نے نطفہ کو لوتھڑے کی شکل میں پیدا کیا پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا۔ پھر بوٹی کو ہڈیاں بنایا اور ہڈیوں کو گوشت پہنایا۔ پھر اُسے نئی صورت دیدی۔ تو مبارک ہے وہ اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔ پھر اُس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے۔ پھر تم کو قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ۭ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ ۝ سورۃ السجدہ - آیۃ (۷ تا ۹)

اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا پھر (مٹی کے نچوڑ) سے جو ایک حقیر پانی ہے اُس کی نسل چلائی پھر اُسے درست کیا اور اس میں اپنی رُوح پھونکی اور تم لوگوں کے لئے کان آنکھیں اور دل بنائے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اُسے یوں ہی چھوڑ دیا گیا۔ جو کیا وہ قطرہ آب نہیں تھا جو ٹپکا گیا تھا پھر خون کا لوتھڑا ہوا پھر اس میں اللہ نے جان ڈالی اور اس کو درست کیا پھر نر اور مادہ کی

الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ سورۃ الزمر۔ آیۃ (۵۳)

ہے۔ وہ یقیناً بخشنے والا (اور) رحم کرنیوالا ہے

قرآن "حالت بہ حالت" آگے لئے جانے کے اصولِ ترقی کی اُن لوگوں کے لئے بار بار یاد دہانی کرتا ہے جو یہ یقین نہیں رکھتے کہ موت ایک نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ اس غرض سے کتاب الٰہی میں انسان کو ان انتہائی موہوم حالات کی یاد دہانی کی گئی ہے جس میں اُسکی پہلی زندگی شروع ہوئی اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ جس طرح ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ تک انسان کی ترقی نمایاں رہی ہے اسی طرح موت کے بعد بھی مقامِ اعلیٰ کی طرف حرکتِ حیات جاری رہیگی۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝ سورۃ نوح۔ آیۃ (۱۴)

حالانکہ اُس نے تم کو مختلف طریقوں سے بتدریج بنایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا ۝ سورۃ الفرقان۔ آیۃ (۵۴)

اور وہی تو ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا۔

وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۝ سورۃ نوح۔ آیۃ (۱۷ و ۱۸)

اور اللہ ہی نے تمکو زمین سے پیدا کیا جو پیدا کرنے کا حق تھا پھر اسی میں تم کو لوٹائیگا اور نکال کھڑا کریگا جو نکال کھڑا کرنے کا حق ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۝ سورۃ طٰہٰ۔ آیۃ (۵۵)

ہم نے تمہیں زمین ہی سے پیدا کیا ہے اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور ہم دوبارہ اسی میں سے تمہیں نکالیں گے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ

اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے

آمد اول با قلیم جماد — وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بحیوانی فتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہمیں میلی کہ دارد سوی آن — خاصہ در وقت بہار و ضیمران
ہمچو میل کودکان با مادران — سر میل خود نداند در لبان
باز از حیوان سوی انسانیش — می کشید آن خالقی کہ دانیش
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاصل و دانا و زشت
عقلہائے اولینش یاد نیست — عمر ازیں عقلش تحول کرد نیست

(دفتر چہارم اطوار و منازل خلقت آدمی از ابتداء)

رومی کا پیشکردہ تصورِ ارتقاء جسے سر محمد اقبال نے جو پیرِ رومی کے شاگرد ہونیکے مدعی ہیں سائنٹفک زبان میں ڈھالا ہے۔ ہمارے لئے کتنی ہی دلکشی کا موجب ہو، ہمیں اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآن کا اصلی منشاء یہ نہیں ہے کہ ایسا کوئی ارتقائی نقشہ پیش کرے جس کی توثیق جدید سائنس کی تحقیقات سے ہو جائے۔ قرآنی اشارے ضرور جدید سائنٹفک حیاتیاتی شرح کے حامل ہیں لیکن رومی کے پیش کردہ نظریہ کی توثیق نہیں کرتے کہ انسان کو اپنے موجودہ مقام حیات تک پہنچنے سے قبل اُسے علی الترتیب ایک معدنی مادہ، پھر ایک نباتی اور پھر ایک حیوانی منزل سے گزرنا پڑا اور اسی سلسلہ میں وہ اپنی موجودہ ہیئت بدل کر ایک فرشتہ کی ہیئت اختیار کریگا وغیرہ۔ بدیہی طور پر مولنا روم ابن مسکویہ (المتوفی ۴۲۱ھ) سے متاثر ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "فوز الکبیر" میں قرآنی اعلانات سے اسی طرح متاثر ہو کر آغازِ انسانی کے متعلق ایک

الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝ سورۃ القیامہ آیۃ (۳۶ تا ۴۰)

دو قسمیں بنائیں۔ کیا ایسا خدا مُردوں کو زندہ نہیں کر سکتا؟

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ سورۃ انشقاق - آیۃ (۱۹)

کہ تم (منازل ہستی کو) درجہ بدرجہ طے کرو گے؟

متذکرۂ بالا قرآنی آیات اور اسی قسم کی دیگر آیتوں نے انسان کے قانونِ ارتقاء اور اس کے انجام کے متعلق چند نظریوں کو اُبھارا ہے لیکن اِن آیات میں جو چیز خاص طور پر جاذبِ توجہ ہوئی ہے وہ ان کا حیاتیاتی پہلو ہے۔ اس موضوع سے مسلم مفکرین کی دلچسپی کا جائزہ لیتے ہوئے سر محمد اقبال مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومی کا اختیار کردہ رجحان بطورِ سند پیش کرتے ہیں۔

"یہ ایک امرِ فطری تھا اور روحِ قرآنی کے پوری طرح موافق بھی کہ مولانا روم نے لافانیت کے مسئلہ کو جس طرح چند حکماءِ اسلام سمجھتے ہیں ایک ایسا مسئلہ نہیں سمجھا جو خالص مابعد طبیعاتی بحثوں سے طے ہو سکے، بلکہ اُسے ایک حیاتیاتی ارتقاء کا مسئلہ قرار دیا لیکن اس نظریۂ ارتقاء نے جدید دنیا کیلئے امید اور جوشِ زندگی کے بجائے مایوسی اور تشویش پیدا کی ہے۔ اس کی وجہ عہدِ جدید کے اس غیر واجبی معروضہ میں ملتی ہے کہ انسان کا موجودہ سانچہ خواہ وہ ذہنی ہو یا عضویاتی، حیاتیاتی ارتقاء کا حرفِ آخر ہے۔ اور یہ کہ موت بحیثیت ایک حیاتیاتی واقعہ کے کوئی تعمیری مفہوم نہیں رکھتی۔ آج کی دنیا کو پھر ایک رومی کی ضرورت ہے جو امید کا احساس پیدا کرے اور زندگی کیلئے جوش اور ولولہ کی آگ سلگائے۔ اُن کے بے نظیر اشعار یہ ہیں:-

اس دور میں اس کی حرکت ایک شعوری حرکت ہوگی۔ (نہ کہ صرف ایک ـــــ بے حس حیاتیاتی تبدیلی)۔

ابتدائی دور میں جبکہ انسان حالتِ تشکیل میں رہتا ہے اس کے لئے کسی ذمہ داری کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کو اپنی تشکیلی حرکتِ ارتقا کا شعور نہیں رہتا لیکن دوسرے دور میں جوں ہی شعور کام کرنے لگتا ہے ذمہ داری کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ اس دوسرے دور کی پہلی منزل موت کی صورت میں ختم ہوتے ہوئے بعد کی تمام منزلوں کے لئے بنیادی کی بنیادی منزل کا کام دیتی ہے۔ یہ پہلی منزل ارادے اور آزادیٔ عمل کی منزل ہے یا قوانینِ حیات کیساتھ ارادی تعاون کی، جس کو فطرتِ انسانی میں رکھی ہوئی میزان کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی پیش آتا ہے اسی کا سلسلہ ہے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ "تمہاری تخلیق اور تمہارا دوبارہ اُٹھنا ایک روح واحد کی طرح ہے"۔ اس منزل میں بھی آگے کی طرف کوچ کیلئے شرط یہی ہے کہ ہر تازہ اقدام کیلئے اس کی مناسبت سے شعوری کوشش ضروری ہے۔ یہ اس اقتضائے دروں میں داخل و شامل ہے جو دورانِ حیات بعد الموت میں روح انسان تجلیاتِ الٰہی کیلئے محسوس کریگی۔

رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۔ سورۃ التحریم۔ آیۃ (۸)

اے ہمارے خدا ہمارے لئے تیری روشنی مکمل کردے۔

یہ حوصلہ مند روح کی ایک سرجیوں دعا ہوگی۔ روشنی کی ہر تازہ قسط زندگی کی ہر اس نئی حالت کا نام ہے جو ہر تازہ موت سے رونما ہوگی۔ وہ موت جو زندگی سے ہمیشہ

ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو موجودہ سائنٹفک نقطہ نظر کا نقشِ اوّل معلوم ہوتا ہے۔ قرآن یقیناً یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ انسان کی تخلیق ایک ارتقائی عمل سے ہوئی ہے اور یہ عمل اس حالت میں بھی جاری رہیگا جسے موت کہتے ہیں۔ لیکن اس میں ایسی واضح ارتقائی منزلیں متعین نہیں ہیں جس طرح رومی کی پیش کی ہوئی ہیں۔

قرآن انسانی تخلیق کے ارتقائی عمل کو دو وسیع ادوار میں تقسیم کرتا ہے پہلا وہ دور ہے جبکہ انسان بتدریج تشکیل پاتا ہے اور شعور حاصل کرنے کے قابل بن جاتا ہے یا قرآنی الفاظ میں "اس میں اللہ کی روح پھونکی" جاتی ہے۔ یہ پہلا دور ہے جس کا حوالہ قرآن اس آیت میں دیتا ہے:۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا — "یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں کئی منزلوں سے بنایا ہے"

سورۃ نوح۔ آیۃ (۱۴)

دوسرا دور انسان کے شکمِ مادر سے باہر آنے کے بعد شروع ہوکر اس سرحد کو عبور کرتے ہوئے جسے موت کہتے ہیں اپنا راستہ طے کرتا جاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس کی طرف قرآن نے اسی آیت میں اشارہ کیا ہے:۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ — تمہیں یقیناً حالت بہ حالت آگے لیجایا جائیگا۔

اس سارے عمل کو ایک حیاتیاتی نوعیت دی جاسکتی ہے لیکن جس ارتقائی حالت کا قرآن خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے وہ خاص کر اخلاقی حیثیت رکھتی ہے اور جسکا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس کا مقصد اس امر پر زور دیتا ہے کہ جس طرح درجہ ادنیٰ سے درجہ اعلیٰ تک انسانی تعمیر کی ترقی واضح رہی ہے۔ اسی طرح اس کی آئندہ ترقی جاری رہے گی اور

پس عدم گردم عدم چوں ارغنون گویدم کہ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

یہاں رومی کے تصور کے مطابق ہی سہی حیاتیاتی عمل کو بھی ایک شعوری کوشش یا ایک فطرتِ اعلیٰ کی تلاش میں فطرت ادنیٰ کی قربانی پر منحصر رکھا گیا ہے۔

فطرتِ اعلیٰ کی تلاش میں کس طرح ہماری موجودہ زندگی میں فطرت ادنیٰ کو نظر انداز یا قربان کیا جائے یا ہماری اسی زندگی میں آئندہ کی زندگی کیلئے آسانی کے ساتھ حرکت کرنے کے مواقع حاصل کئے جائیں ایک ایسا مسئلہ ہے جو غور و فکر کیلئے اس وقت ہمارے درپیش ہوتا ہے۔ اس کا جواب قرآن نے پہلے ہی دیدیا ہے کہ "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" لیکن حیاتِ مابعد کے تصور کے پیشِ نظر عملِ صالح کی نوعیت کیا قرار پائیگی؟

یاد ہوگا کہ قرآن نے انسان کو "زمین پر اللہ کا نائب قرار دیا ہے" واضح ہوگا کہ یہ اصطلاح اس کی مابعد کی زندگی کے متعلق نہ استعمال کی گئی ہے نہ دہرائی گئی ہے۔ اسکی وجہ صاف ہے۔ توحید الٰہی پر اور وقتاً فوقتاً اس کے رسولوں کے ذریعہ بھیجے ہوئے پیام کی صداقت پر ایمان انسانی اتحاد یا اس کے لئے ایک پُرامن نظام زندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ منصبِ خلافت کا مفہوم اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ اس کا تعلق اسی مقصد خاص سے ہو۔ یہ منصب موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد کی زندگی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اس کے عمل کیلئے وہاں کوئی سماجی، معاشی یا سیاسی پس منظر نہیں رہتا۔ وہاں خداوند تعالیٰ کو انکشاف کے ذریعہ یا پردے کے پیچھے سے یا کسی رسول کے ذریعہ انسان سے مخاطب ہونے کی ضرورت

ہم آغوش رہ کر ہر نئی حالت کو وجود میں لاتی ہے:-

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ ۝ — ہم نے تمہارے درمیان موت مقرر کر دی ہے۔

سورۃ الواقعہ - آیۃ (۶۰)

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا — پاک ہے وہ ذات جس نے موت اور زندگی کو ساتھ ساتھ پیدا کیا ہے تاکہ یہ امتحان لے تم میں سے عمل میں کون سب سے بہتر ہے۔

سورۃ الملک - آیۃ (۲)

اس ارتقائی سلسلہ حیات میں یہاں سے وہاں تک داخلی روحانی پہلو ہی بار بار نمایاں ہوتا ہے۔

یہ وہ اخلاقیاتی نقطۂ نظر ہے جس پر قرآن انسانی ہدایت کے لئے زور دینا چاہتا ہے نہ کہ حیاتیاتی پہلو پر۔ سر محمد اقبال کے پیش کردہ اشعار سے حیاتیاتی رجحان کے ظاہر ہونے کے باوجود مولانا روم نے اس اخلاقیاتی داخلی روحانی نقطہ نظر کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس کا ثبوت حسب ذیل اشعار میں اُسی حیاتیاتی عمل کی ایک دوسری تشریح سے ملتا ہے۔

از جمادی مردم و نامی شدم — وز نما مردم بحیوان بر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کی ز مردن کم شدم
جملہ دیگر بمیرم از بشر — تا برآرم از ملائک پر و سر
وز ملک ہم بایدم جستن ز جو — کل شیٔ ھالک الا وجھہ
بار دیگر از ملک قربان شوم — آنچ اندر وہم ناید آن شوم

زیادہ نور کیلئے بے قرار رہیگا۔ اس کی ہمیشہ دعا قرآن کے مطابق یہ ہوگی :-
"اے پروردگار ہمارے لئے نور مکمل کردے"، وہ نور جو اُسے حقیقت کے حضور پہنچادے یا قرآنی الفاظ میں "وجہ اللہ" یا وہ روشنی جو زمین و آسمان کا نور ہے اسے دکھادے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا
مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ
اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ
دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ
مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ
وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا
يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط
نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط يَهْدِي اللّٰهُ
لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ
اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ سورۃ النور۔ آیۃ (۳۵)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک طاق ہے جس میں ایک چراغ ہے اور چراغ ایک شیشہ میں ہے۔ شیشہ ایسا ہے گویا ایک روشن ستارہ ہے۔ اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے یعنی زیتون جو نہ شرقی جانب ہے اور نہ غربی جانب۔ اس کا تیل خود بخود جل اُٹھنے کو ہے خواہ اُسے آگ بھی نہ چھوئے، روشنی پر روشنی ہو رہی۔ اللہ اپنے اس نور تک جسکو چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کیلئے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔

اس نور کی خواہش اسی دنیا میں شروع ہو جانی چاہئے۔ یہ اُن لوگوں کیلئے ممکن ہوگا جو ہر موقع پر "حضور قلب" یا "قرب الٰہی" کا احساس رکھیں گے۔ ایک

باقی نہیں رہتی جیسا کہ سورۃ الشوریٰ آیۃ (۱۵) میں ہے۔ اس کے برعکس انسان حقیقت کے روبرو آجاتا ہے اور اس روشنی کی رہبری میں جو اس کی اپنی زندگی کے صلہ میں حاصل ہوگی اپنا راستہ آپ نکالتا ہے۔ وہاں نہ تو دولت کام آئے گی اور نہ قوت، نہ وہاں جمہوریتوں یا پارلیمانوں یا انتخابات یا تحفظ عالم کی تجویزوں کا ذکر ہوگا۔ اس دنیا کے ان زبردست مقتدر و ذی شان لوگوں کو جنہوں نے غیر صالح زندگی بسر کی ہوگی۔ اپنے ان غلاموں کیلئے راہ ترقی سے ہٹ جانا ہوگا جنہوں نے نیک زندگی بسر کی ہوگی۔ قرآن فرماتا ہے:۔ وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ سورۃ بنی اسرائیل۔ آیۃ (۷۲) "اور جو اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہیگا اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا" یہی وہ راستہ ہے جس کیلئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن کی یہ خواہش ہے کہ انسان اسی دنیا میں اس راستے پر قدم رکھے تاکہ دوسری دنیا میں خوبی اور آزادی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھ سکے قرآن کا بیان ہے:۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۝ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ سورۃ العنکبوت آیۃ (۶۴)

اس دنیا کی زندگی جذبات کا ایک کھیل ہے اور حقیقی زندگی تو دوسری دنیا کی ہے۔

اس حقیقی زندگی کو اسی دنیا میں شروع کرنا ہوگا۔

"حقیقی زندگی" کی خصوصیت یہ ہوگی کہ تکمیل حیات کا راستہ چلنے والا نور اور

امنوا وعملوا الصالحات کا حکم اس شخص کیلئے جو اپنے ہر تاثیر اور عمل میں احساس الٰہی رکھتا ہے ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ خدا کے اس احساس سے اُن لوگوں میں جو کسی کام کو یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ اسے کرنا ہے، یا اُن پر فرض ہے یا اس سے اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے، یا دنیوی پریشانیاں دور ہوتی ہیں! اور اُن لوگوں میں جو کسی نیک عمل کو یہ سمجھکر نہیں کرتے کہ اس کا صلہ ملیگا بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ نیک کام فی نفسہٖ نیک ہے۔ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، اور اس خیال سے انہیں سکون قلب حاصل ہوتا ہے نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو اُس جستی لڑکے کو جس کا تعارف ہمارے ابتدائی باب میں ہو چکا ہے، نمایاں طور پر حاصل تھا اور اسی احساس کا پیدا کرنا ہر اس انسان کے لئے ضروری ہے جو اپنی زندگی کی دوسری منزل میں حالت بہ حالت آگے بڑھنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس نوع کے مرد اور عورتوں کو جنت سے کوئی دوامی دلچسپی نہیں ہوتی۔ بغداد کے شیخ اعظم حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح وہ یہ حوصلہ رکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ جنت میں داخل ہونے کے بعد اُسے پیچھے چھوڑ دیں اور زیادہ تجلی اور زیادہ تکمیل کے لئے اپنے قدم آگے بڑھاتے جائیں۔ سلہ

لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنے اس خاکی ماحول ہی میں اس قسم کی حیاتِ مابعد جو "حقیقی زندگی" ہے بسر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن کے مطابق کوئی زندگی زندگی ہی نہیں جو اس نوعیت کی نہ ہو اور یہ اس وقت

عالم کیف و سرور میں رسولِ خدا نے یہ دعا فرمائی تھی :-

اللھم اجعل فی قلبی نوراً و فی بصری نوراً و فی سمعی نوراً و عن یمینی نوراً و عن شمالی نوراً و من امامی نوراً و من خلفی نوراً واجعل لی نوراً و فی عصبی نوراً و فی لحمی نوراً و فی دمی نوراً و فی شعری نوراً و فی بشری نوراً و فی لسانی نوراً و اجعل فی نفسی نوراً و اعظم لی نوراً و اجعلنی نوراً و اجعل من فوق نوراً و من تحتی نوراً اللھم اعطنی نوراً۔

اے اللہ! بھر دے میرے دل میں نور اور بھر دے میری آنکھوں میں نور اور بھر دے میرے کانوں میں نور اور ڈال دے میرے سیدھے جانب نور اور بائیں جانب نور اور ڈال دے میرے آگے نور اور پیچھے نور اور دے مجھکو نور اور میرے اعصاب میں نور بھر دے اور میرے گوشت میں نور بھر دے اور میرے خون میں نور بھر دے اور سما دے میرے بالوں میں نور اور میرے پوست میں نور اور میری زبان میں نور دے اور میرے نفس میں نور بھر دے اور میرے لئے نور میں اضافہ کر اور مجھے خود نور بنا دے اور مجھے نور سے گھیر دے اے اللہ مجھے عطا کر نور ہی نور۔ ۱۸

باب ہفتم

اُمَّۃً وَسَطاً

گذشتہ صفحات میں اس ذہن پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی سعی کی گئی تھی جس کی تعمیر کرنا قرآن مجید کا منشا ہے۔ ایسا ذہن جو دنیا کو اپنے صالحین و متقین و مقسطین و مفلحین اور اپنے صادقین و صدیقین اور اس سلسلہ کی دیگر ہستیاں دیا کرتا ہے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے! اور جو اس احساس ذاتِ باری کے شعور کامل کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور اس پر عمل کرتے ہیں، جو اُن میں ترقی پا چکا ہے۔ اس قسم کے ڈھلے ہوئے ذہن رکھنے والے افراد کی جماعت یعنے اصحاب رسول اللہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کو قرآن نے امۃً وسطاً کا لقب عطا کیا ہے یعنی وہ جماعت جو "وسط زرین" کا مقام رکھتی ہے، ایک متوازی زندگی بسر کی ہو اور جو دوسروں کیلئے ایک مثال بنتی ہو جس طرح کہ رسول اللہ اُن کے لئے مثال تھے۔ یہ اصطلاح اس کردار کی نوعیت کی شرح کرتی ہے جو اجتماعی سطح پر ذہن انسان کو حاصل کرنی ہے۔

یہ وہ امۃً وسطاً تھی جسے رسولِ خدا نے ایک مملکت کی صورت عطا فرمائی جو اسلام کی اولین مملکت تھی اور یہ ایسی تنظیم تھی جو آگے چل کر ایک عالمی

تک ممکن نہیں جب تک کوئی فرد کسی نہ کسی مقدار میں اس احساس الٰہی کو فروغ نہ دے جس کا ذکر ہم نے کیا ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو ایک تناسب کے ساتھ اسی قدر ترقی کرتا ہے جس قدر کہ وہ احساسِ خودی کو اپنے قابو میں رکھتا ہے یا اُسے اِس احساسِ الٰہی کے تابع کر دیتا ہے۔

عام بنی نوع انسان کیلئے قرآن نے عمل کا معیار یہ قرار نہیں دیا ہے کہ وہ اپنے احساسِ خودی کو کاملاً خارج کر دیں۔ یہ اقتضائے دروں صرف اسی قسم کے ذہنوں کا ہے جو اپنی مسرت کیلئے خدا میں "جذب کامل" چاہتے ہیں یا صوفیانہ اصطلاح میں "فنا فی اللہ" ہونا چاہتے ہیں۔ اِس قسم کے باطنی تقاضے کے حق سے کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن خدا میں جذب ہونے کا تجربہ جو صوفیانہ ہوتا ہے انسانی معاشرہ کے لئے اسی حد تک مفید ہے جس حد تک وہ ایک ایسے تصور میں ڈھل جائے جس کی قدر و قیمت جس طرح پچھلے باب میں بتلائی گئی ہے انسان کیلئے سماجی یا روحانی افادیت کی ہو۔ قرآن انسان کو جس چیز کے حاصل کرنے کی خواہش یا تلقین کرتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے احساسِ خودی کو کاملاً فراموش کر جائے، بلکہ اس کو اپنے داخلی احساسِ رب کے ساتھ مربوط کر دے یا دونوں میں ایک توازن برقرار رکھے۔ اس کا نام تقویٰ یا متوازی زندگی ہے۔ یہ صفت اس ذہن کی ہے جو قرآن تشکیل دینا چاہتا ہے، وہ ذہن جو زندگی کو خدا کا ایک عطیہ اور ایک مقدس امانت سمجھتا ہے جس کے ذریعہ وہ ہر آن "وجہ اللہ" کے حضور میں رہ سکے۔ اور جو اس سے ظہور میں آنے والی تجلیوں سے ہدایت پاکر خود سراپا نور ہو جائے تاکہ اندھیرے میں جد و جہد کرنے والوں کیلئے ایک مشعلِ ہدایت بن سکے۔

اصول کو قبول نہیں کیا کہ مملکت کا اقتدار اعلیٰ عوام میں مرکوز ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے کہ سارا اقتدار خدا اور صرف خدا کو ہی حاصل ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کی نئی مملکت کو پادشاہت سے بھی موسوم نہیں کیا جاسکتا تھا چہ جائے کہ اُسے آمریت کہا جائے کیونکہ نہ تو رسول اللہ نے نہ خلفائے راشدین نے اپنے لئے وہ لقب پسند کیا جو خداوند تعالیٰ کیلئے مخصوص تھا اور نہ کوئی آمرانہ حق طلب فرمایا رسول اللہ کو صرف یہ کرنا تھا کہ وقتاً فوقتاً جو وحی رشد و ہدایت کی ملتی رہی اُسکے مطابق عمل کریں یا اپنے اصحاب کے مشورے سے جو راہ نکل آئے اختیار کریں خلفائے راشدین نے بھی یہی روش اختیار کی۔ اگرچہ کہ نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے جن کے متعلق کوئی خاص قرآنی ہدایت تھی اور نہ رسول اللہ کا عمل۔ انہوں نے قرآن کی دوسری تدبیر یعنی "مشاورت باہمی" کے اصول کو آزادی کے ساتھ اختیار کیا۔ اس طریقہ کو "اجتہاد" کہتے ہیں۔ جن اصحاب سے انہوں نے مشورہ کیا وہ ممتاز تجربہ کار لوگ تھے۔ انہیں اجماع یعنی عوام کا اعتماد حاصل تھا اور یہ "شوریٰ" کہلاتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی مملکت کو جس کا مقصد جمہوری طریقوں پر قانون کا اقتدار جس کا اساسی جزو خود قرآن نافذ کرتا ہے اور جو ایمائے ربانی سمجھا جاتا ہے قائم کرنا تھا کس نام سے موسوم کیا جائے؟ اس کا جواب اس مقصد میں ملیگا جو اساسی قوانین الٰہی کی تہ میں کارفرما ہے۔ وہ یہی تھا کہ وہ امت یا مسلم جماعت کی اجتماعی زندگی کیلئے ایک واضح ثقافتی پس منظر پیش کرے یا

تنظیم کا مرکز یا نقطۂ آغاز بن سکتی تھی۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے اپنی امت کو ایک مملکت کے سانچے میں ڈھالا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو صرف اتنا وقت مل سکا کہ اس کی بنیاد رکھ سکیں اور عمارت تیار کرنے کا کام آنے والوں کیلئے چھوڑ دیں۔ آپکا اساسی اور فوری نشانہ تو یہ تھا کہ فرد کی شخصیت کو ابھاریں اور اس میں ایسی صلاحیتیں پیدا کریں کہ وہ اپنے آپ سے امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکے اور اسی طرح خارجی دنیا کے ساتھ بھی۔ آپ نے یہ کام اس یقین کامل کے ساتھ فرمایا کہ صحیح نمونے کے مرد و عورت جب پیدا ہونگے تو ان کی منظم و متحد زندگی کے قابل ایک سیاسی تنظیم لازماً صحیح خطوط پر اُبھر آہی جائے گی۔

مملکت کی تخلیق اور ابتدائی نشوونما کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کسی طرح آسان نہیں ہے کہ ہم اس مملکت کو تاریخ میں پیدا شدہ اقسام حکومت میں سے کسی ایک نام سے موسوم کرسکیں۔ وہ یقیناً ایک مذہبی پیشواؤں کی مملکت نہیں تھی، کیونکہ یہاں مذہبی پیشواؤں کی کوئی ایسی جماعت وجود میں نہیں لائی گئی جو خدا کی براہ راست ہدایت کے ساتھ سیاسی اقتدار استعمال کرتی ہو۔ ایسی جماعت جو خصوصاً بنی اسرائیل میں ایک زمانہ تک برسر کار رہی۔ قرآن کسی قسم کی سیاسی پادریت کو روا رکھ ہی نہیں سکتا۔ پیغمبر کی چھوڑی ہوئی اس نوخیز مملکت نے خلفائے راشدین کے اوّلین عہد حکومت میں چند ایسے خصائص پیدا کرلئے جو میدانِ عمل میں مکمل سیاسی اور معاشی جمہوریت کی عکاسی کرتے تھے لیکن اُس نے اپنے جمہوری طرز حکومت کے نظریاتی طریق فکر میں موجودہ جمہوریت کے اُس بنیادی

بناء پر کہ اس جمہوری زندگی کا پس منظر مذہب اور اسکی تعلیمات سے متعلق کیا جاسکتا ہے اسے ایک مذہبی مملکت یا مذہبی پیشواؤں کی حکومت قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی مملکت خواہ وہ کتنی ہی "سیکولر" یا معاملاتی ہو اپنے عمل میں کسی نہ کسی روحانی یا اخلاقی پس منظر کے بغیر قائم رہ ہی نہیں سکتی ۔ واضح طور پر اتنا فرق ملحوظ رکھنا ہوگا کہ پس منظر ایک چیز ہے اور اس کے اصولوں کو روبہ عمل لانا دوسری چیز ہے۔ یہ دوسری چیز یقیناً معاملاتی حیثیت رکھتی ہے لیکن اول الذکر کا مقصد یہ ہے کہ وہ معاملات میں ایک ثقافتی اور اخلاقی جوہر پیدا کرے۔ یہ فرق زندگی کے اس قرآنی نقطہ نظر میں مضمر ہے جو اس کے عمل کو حقوق اللہ اور حقوق الناس یا حقوق العباد میں تقسیم کرتا ہے۔ حقوق اللہ مثلاً عقائد، عبادت، قلب وجسم کی صفائی، اولاً فرد کی شخصی ذمہ داریاں ہیں جن کی جوابدہی بالراست اللہ ہی سے متعلق ہے۔ اِلّا اس کے کہ عام طور پر اس کا لحاظ نہ رکھنے سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہو اسکی بجائے حقوق الناس، یا سماجی ملحوظات مملکت کے دائرہ عمل میں آتے ہیں۔ یہ زیادہ تر معاملاتی اُمور انسان اور انسان کے درمیان تعلقات سے سروکار رکھتے ہیں اور یہ لازماً معاملاتی طریقہ انتظام سے سرانجام پاتے ہیں۔ خلفائے راشدین نے یہ دیکھ کر کہ امت کو ابھی عبوری دور سے گزرنا ہے حقوق اللہ کی پابندی پر ایک قسم کی سرپرستانہ نظر رکھی اور جس وقت ضرورت ہوئی نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کیلئے اپنے رفقاء کے مشورے سے ان کی تشریح کی لیکن

اُس میں ایک روحانی زندگی پیدا کرے۔ اِسی پس منظر کی روشنی میں مملکت کے جملہ امور کو طے کرنا ضروری تھا۔ وہ بھی کسی مذہبی پیشواؤں کے محکمہ کے ذریعے نہیں بلکہ مشاورت باہمی کے ذریعہ۔ اس طرح اس نئی مملکت کا چہرہ یقیناً جمہوری تھا لیکن اپنے نقطۂ نظر اور ذمہ داری میں ان پچھلے نمونوں سے مختلف تھا جو یونانی اور رومی تھے اور جو صرف خاص گروہوں کے مفاد کی خاطر تشکیل پائے تھے مثلاً یونان کی جمہوریت میں جو "آواز جمہور" کہلاتی تھی اسکا بدل یہاں "اجماع" یا کثرتِ آرا رتھا۔ اِن دونوں میں جو فرق ہے وہ اس ذمہ داری کے اِحساس میں پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ عوام کی آواز پر عمل ہوتا تھا اور مملکت کے کاروبار چلائے جاتے تھے۔ اس جمہوری مملکت کے عوام کی ذمہ داری جو کسی امر انتظامی میں اپنی منظوری دیتے تھے بے شک اہل یونان کی طرح انہیں پر منحصر تھی لیکن یہ ضروری تھا کہ اس میں اُس بزرگ و برتر قوت یعنی خدائے تعالیٰ کے سامنے جو مالکِ حقیقی ہے کامل جواب دہی اور ذمہ داری کا احساس اور ہدایت بھی شامل ہو۔ یہی احساس ہر ایک کیلئے واجب تھا خواہ وہ خود خلیفہ ہو، یا مجلسِ شوریٰ ہو یا کوئی عہدہ دار جو خلیفہ کی طرف سے مقرر کیا جاتا۔

اِس طرح عرب کا نیا جمہوریہ خدا سے ڈرنے والے افراد کا جمہوریہ تھا اور اِس کا انتظام قرآن کے نظریۂ عدل و احسان کے مطابق صالحین کی وہ جماعت کرتی تھی جو مشہور، ممتاز اور راست باز انسانوں پر مشتمل ہوتی تھی اور جو ہر شہری کو ایک صالح زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کرتی تھی محض اس

صحیح جمہوری قالب میں ڈھالنے کا وعدہ تھا۔ لیکن خلافت پر فائز ہونے کے تیسرے ہی سال آپکا انتقال ہوگیا۔ آپ کے اس منصب خلافت کو حضرت عمرؓ نے سنبھالا اور توانائی کے ساتھ جاری رکھا۔ لیکن اس تجربہ کی تکمیل کے لئے آپ کی عمر نے بھی وفا نہ کی۔ خلافت کے دسویں سال ہی میں ایک ایرانی بدیسی نے آپکو قتل کردیا۔ آپ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے۔ لیکن یہ بھی غالباً اس زمانے کی رقابتوں کی زد میں آکر یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ یہی چار خلفاء ہیں جنہیں "راشدین" یعنی صحیح ہدایت یافتہ سے خطاب کیا جاتا ہے۔ ان کی خلافت کا زمانہ تیس سال سے زیادہ پر محتوی نہیں ہے۔ یہی وہ عہد ہے جسے ہم اسلامی سیاست میں جمہوری تجربہ کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ اس میں جو روح کارفرما تھی وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عروج کو پہنچی اور حضرت علیؓ کی شہادت میں گم ہوگئی۔

اسلامی مملکت کو خلفائے راشدین عوام کی مملکت سمجھتے تھے اور من حیث الکل یہ عوام ہی کی فلاح و بہبود کیلئے چلائی گئی تھی۔ کسی شخص کو ذاتی طور پر کوئی خاص مراعات حاصل نہ تھیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خلیفہ کو برابر کے لوگوں پر اوّلیت حاصل تھی۔ سادات کی مثال یہ ہے کہ جب مدینہ میں غذا اور لباس کی رشننگ ہوئی تو خلیفہ کو بھی ایک عام شہری کی طرح صرف اس کا متقرر حصہ ملا۔ امور مملکت سے متعلق کسی مسئلہ میں بھی ہر مرد اور عورت کو استفسار کا پورا پورا حق حاصل تھا۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو قانون سے بالاتر ہو۔

اِس طریقہ عمل سے ان کا عہدۂ امت کے روحانی سردار کا نہیں بن گیا۔ حقوق اللہ اور حقوق الناس کی پابندی پر خلیفہ بھی ایسے ہی مکلف تھے جس طرح جماعت کے دوسرے افراد۔ ایک کے عمل کا اثر اور عکس دوسرے کے عمل میں نظر آسکتا تھا۔

ملاحظہ ہو کہ نئی مملکت کی خلافت قبول فرماتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہدہ کو کس نظر سے دیکھا۔ آپنے اپنے پہلے ہی خطبہ میں فرمایا:۔

"میرے ساتھیو! میں خدا کو گواہ رکھتا ہوں، مجھے اس عہدے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ نہ میں نے اس کو حاصل کرنے کی خواہش کی، نہ میں نے چھپ کر نہ ظاہری طور پر اس کے لئے کوئی دعا مانگی۔ میں نے یہ عہدہ صرف اس لئے قبول کیا ہے کہ کہیں فتنہ و فساد سر نہ اٹھائے ورنہ قیادت و رہبری میں کوئی مسرت نہیں ہے۔ اس کے برعکس جو بوجھ میرے شانوں پر ڈالا گیا ہے، میں سمجھتا ہوں اُسے برداشت کرنے کی مجھ میں ذاتی طاقت نہیں ہے۔ میں سوائے اعانت ایزدی کے اس منصب کو پورا نہیں کرسکتا۔ گو میں آپ پر کسی طرح فوقیت نہیں رکھتا مگر آپ نے مجھے اپنا قائد بنایا ہے۔ اگر میں برحق رہوں تو میرے ساتھ تعاون کرنا۔ اگر غلطی کروں تو اسکی صحت کرنا جب تک میں خدا اور رسول کے احکام کی اتباع کروں میرا ساتھ دینا اور اگر منحرف ہو جاؤں تو مجھ سے منہ پھیر لینا۔"

اپنے قلب میں ہر آن قائم رہنے والے احساس خداوندی کے فیضان کے ساتھ خلیفہ اوّل نے جس کوشش کا یہاں وعدہ فرمایا ہے وہ اپنی نئی مملکت کو

شمعہ برابر ہوا بھی کھانے کا مستحق نہ ہوگا۔ ان کی حفاظت کرو۔ وہ میرے ذمّی ہیں۔" حضرت عمرؓ جب تلوار کھاکر زخمی ہوئے تو ایسی ہی ساعت میں انہیں بھی ذمّی یاد آئے تو آپ نے فرمایا " اس شخص کو جو میرے بعد خلیفہ ہوگا میں اپنی یہ آرزو اور وصیت سونپتا ہوں۔ ذمّی خدا اور رسول کی حفظ و امان میں ہیں۔ اُن معاہدوں کا احترام کرو جو اُن سے کئے گئے ہیں اور جب ضرورت ہو ان کے مرداد کے لئے لڑو اور ان پر ایسا بار اور ذمہ داری نہ ڈالو جسے وہ برداشت نہ کرسکیں۔"

سر تھامس آرنلڈ اپنی کتاب " تبلیغ اسلام " میں بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیت المقدس فتح ہوا تو حسب ذیل شرائط مرتب ہوئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - میں عمر خدا کا ایک بندہ امیر المومنین۔ بیت المقدس کے عوام کیلئے حسب ذیل معاہدات منظور کرتا ہوں۔ میں انہیں ضمانت دیتا ہوں ان کے جان و مال کی حفاظت کی اُنکے بچوں۔ عبادت گاہوں، ان کے صلیبوں کی اور ہر اس چیز کی جن سے انکی جان کی حفاظت ہو۔ ان کی زمین کی اور سب کو اُن کے مذہب کی۔ ان کی عبادت گاہوں کو نہ کمزور کیا جائیگا، نہ برباد کیا جائیگا، اور نہ کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کے اوقاف کو، نہ ان کی شان اور مرتبے کو۔ نہ ان کی ملکیت کی کسی شئے کو، اور نہ بیت المقدس کے باشندوں پر اپنی مذہبی پابندیوں کی وجہ سے کوئی تشدد روا ہوگا۔

حضرت عمرؓ کو خود اپنے معمور کردہ قاضی کے سامنے ایک معاملہ میں جواب دہی کیلئے پیش ہونا پڑا۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک یہودی کے مقابلہ میں استغاثہ پیش کیا اور فیصلہ یہودی کے حق میں ہوا۔ قرآن نے زندگی کے جو معاشی اصول بنائے تھے اور جس میں زور دیا گیا تھا کہ غریبوں کی امداد کیلئے متمول افراد کی آمدنی کا کچھ حصہ مختص کیا جائے۔ ان پر مملکت میں بڑی دیانت کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا۔ مملکت کا خزانہ عوام کا خزانہ تصور کیا جاتا تھا اور اگر ختم سال پر کچھ رقم خزانہ میں بچ رہتی تو وہ بطور وظیفہ ضروریات کے مطابق عوام ہی میں تقسیم ہوتی تھی اور اس طرح عوام کی رقم عوام ہی کو لوٹا دی جاتی تھی۔ وہ قرآنی احکام جو عورتوں کی حیثیت کو آزاد معاشی عناصر قرار دیتے ہیں اور جن کی رو سے وہ اپنے مال کو اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ وہ نہایت احترام و احتیاط کے ساتھ روبہ عمل لائے جاتے تھے۔

جان و مال کا تحفظ اور آزادی ضمیر کی ضمانت اُن غیر مسلموں کی دی جاتی تھی جنہیں "ذمی" یعنی "خدا اور رسول کی حفاظت میں رہنے والے" کہا جاتا تھا پیغمبر خدا نے اعلان فرمایا تھا کہ "خبردار قیامت کے دن میں خود اس شخص کے خلاف دعویدار ہونگا جو کسی "ذمّی" کو ستاتا ہے یا اُس پر ایسی ذمہ داری رکھتا ہے جو اس کے بس کی نہ ہو یا اس شئے سے محروم کرتا ہے جو اسکی ملک ہو"۔ آپ کو اُن کی فلاح و بہبود کا واقعی اتنا خیال تھا کہ وصال سے کچھ پہلے آپ کو ذمّی کا خیال آگیا۔ آپ نے فرمایا "وہ شخص جو کسی ذمّی کو قتل کرے جنّت کی

گوشہ نشین ہوگئے ہوں، انہیں امن کے ساتھ ان کے حال پر چھوڑ دو۔"

راشدین کی اس جمہوریت کو جو تاریخ انسانی کے تاریک دور میں ایک مثالی مملکت کی صفات کا مظہر تھی، اگر مسلسل آزاد زندگی ملتی تو یقیناً رسول خدا کے تصور کے مطابق ایک عالمی وفاق کی صورت اختیار کرتی جس کا ہر رکن دوسرے کیلئے "کا۔بان" ہوتا لیکن یہ ہونا نہ تھا! اسلام کا حزینہ یہ ہے کہ یہ نوزائیدہ نازک پودا پھلنے پھولنے ہی نہ پایا۔ وصال نبوی کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کے پیروؤں ہی کے ہاتھوں اسکا استیصال ہوگیا اور اسلام کے نام پر مختلف قسم کی مطلق العنانی میں بدل گیا۔ لیکن مدت خواہ کتنی ہی کم ہو جبتک یہ جمہوریت قائم رہی کم از کم اپنی روشن ساعتوں میں اس نے امتہ وسطاً کی طرح باشعور طریقے پر کام کیا۔

دور جدید کے علماء عہد نبوی کو "حکومت الٰہیہ" قرار دیتے ہوئے اس کا اطلاق عہد راشدین پر بھی کرتے ہیں، اگرچہ راشدین کے زمانے کے حالات وہ نہ تھے جو عہد نبوی کے تھے۔ یہ علماء ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں۔ چونکہ راشدین اصحاب رسول تھے اور شخصی طور پر یا بلا واسطہ جس طرح ان کو علم تھا وہ سنت نبوی کی روشنی میں ان احکام کی تعمیل کرتے تھے جو قرآن نے دیئے تھے اس لئے اسلام کے اساسی قانون تک انکی رسائی اسی انداز کی تھی۔ لیکن ہمارے علماء اس اصطلاح کو اس نظام پر بھی منطبق کرتے ہیں جو دوسری اور تیسری صدی ہجری کے فقہاء نے اپنے زمانے کی مروجہ روایات و تشریحات

نہ اُن میں سے کسی کو اذیت پہنچائی جائے گی۔ ۵

پھر آرنلڈ یہ لکھتے ہیں :۔

"بطرق کی معیت میں حضرت عمرؓ نے مقامات مقدسہ کی زیارت کی اور کہا جاتا ہے کہ جب عیسائیوں کی سب سے مشہور گرجا میں پہنچے تو نماز کا وقت آچکا تھا۔ بطرق نے حضرت عمرؓ سے نماز ادا فرمانے کیلئے کہا لیکن آپ نے کچھ غور کے بعد یہ کہکر انکار فرمایا کہ اگر آپ ایسا کرینگے تو آپ کے تابعین آگے چل کر اسے اپنی عبادت گاہ قرار دینگے۔ ۶

عمل کے دوسرے دائروں کی طرح حالت جنگ میں بھی خلفائے راشدین نے کبھی انسان دوست رجحانات کو جن کا حکم قرآن نے دیا تھا نظر سے دور نہیں کیا۔ آرنلڈ کہتے ہیں کہ "فاتحین کے ایسے ضبطِ نفس اور انسانیت کی وجہ سے جو انہوں نے اپنی فتوحات میں دکھائی۔ ان کے اس لشکر کی بڑی تعظیم کی گئی ہوگی اور اسے خوش آمدید کہا گیا ہوگا۔ جو انصاف اور اعتدال کے اُن اصولوں پہ عمل پیرا تھا جن کو حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول نے شام کی مہم کے وقت مقرر فرمایا

"انصاف پر قائم رہو، اپنے عہد و پیمان کو نہ توڑو، کسی جسمانی عضو کو نہ کاٹو، بچوں کو قتل نہ کرو اور نہ عورتوں اور بوڑھوں کو، کھجور کے درخت کو نقصان نہ پہنچاؤ اور نہ انہیں جلاؤ اور نہ ثمردار درختوں کو کاٹو۔ مویشیوں، کھلوں اور اونٹوں کو غذا حاصل کرنے کے سوائے ذبح نہ کرو۔ شاید تمہیں ایسے بھی لوگ ملیں جو خانقاہوں میں

بھی ناخوش نہ رکھا جائے اور دوسری طرف دورِ جدید کے جمہوری تصور سے بھی انحراف نہ کیا جائے، عالمِ اسلام کے بعض حصّوں میں ایک درمیانی راستہ یہ نکالا جا رہا ہے کہ راشدین کی جمہوری طرزِ حکومت کا احیا کیا جائے لیکن کیا یہ اس وقت تک ممکن ہے جب تک کہ عہدِ راشدین کی فضا کا بھی احیا نہ ہو جس کو غائب ہو کر زمانہ گزرا اور جس کی فضا ہی میں راشدی طرزِ حکومت پھل پھول سکے گی؟ اگر یہ ممکن بھی ہو تو کیا یہ آجکل کی فضا کے سانچوں میں ٹھیک بیٹھ سکیگی؟ اس کے معنی یہ ہونگے کہ زندگی کو تیرہ سو سال پیچھے دھکیل دیا جائے اور ہم دنیا سے منقطع ہو کر رہ جائیں جو ظاہر ہے کہ قطعاً ناممکن ہے۔ اس کے قطع نظر یہ بھی یاد رہے کہ راشدین اور ان کے مشیر وہ لوگ تھے جنہوں نے رسولِ خدا کے ساتھ زندگی بسر کی تھی اور سنت یا اس روحِ عمل سے واقف تھے جس کے ذریعہ حضور اپنی امت کے امورِ زندگی کا انصرام فرماتے اور جن کو آپؐ نے امّۃ وسطاً کی صفات سے متصف فرمایا تھا لیکن اب اتنے عرصہ کے بعد اس کا صحیح علم کس طرح حاصل ہو سکتا ہے یا اس کی واضح تصویر کس طرح نظر آسکتی ہے جب تک کہ قرونِ وسطیٰ کا وہ غلاف نہ اٹھایا جائے جو اس پر چڑھا ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کیا ہم اپنے ذہن سے وہ سب کچھ محو کر دینے آمادہ ہیں جو غیر قرآنی ہے اور جو اسکی خانہ جنگیوں اسکی مذہبی فرقہ بندیوں۔ اس کی مطلق العنانی اور جاگیریت اور دیگر داغہائے نمایاں کے ساتھ ہمارے ماضی سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے اور اپنے لئے

احکام قرآنی کی روشنی میں مرتب کیا تھا۔ اس نوع کے نظام یا قانون کو "فقہ" کہتے ہیں اور یہ مختلف مذاہب میں منقسم ہے جن میں سے ہر ایک حدِ عمل تک اسلام کا قطعی اور حتمی قانون بنا ہوا ہے۔ اس قانون کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ یہ کئی صورتوں میں نتیجہ ہے "اجتہاد" کا جو اس کے واضعین نے اختیار کیا لیکن اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ جو لوگ بعد کو آئیں وہ اپنے لئے اس حق اجتہاد کو استعمال نہیں کر سکیں گے۔ حالانکہ قرآن کا اساسی حکم یہ ہے کہ اپنے معاملات میں "مشاورت کرو" اور یہ حکم کسی خاص زمانے سے مختص نہیں کیا گیا۔ زندگی کے اہم معاملات میں تو یہی انداز فکر رہا ہے۔ یہ فقہ جسے شریعت بھی کہتے ہیں اور جسے قرون وسطیٰ کے فقہاء نے اپنے زمانے کے ماحول کو سامنے رکھ کر وضع کیا تھا۔ ہمارے علماء کے نزدیک ابدی قانون اسلام ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلم مملکت اس کا احیاء کرے اور من وعن عہد حاضر میں اُسے نافذ کرے۔ چونکہ خدا کسی مرئی صورت میں انسان کے آگے اس کے کاروبار میں حصہ لینے نہیں آتا۔ اس لئے علماء اس احیائی صورت میں حکومتِ الٰہی سے یہ مراد لینا چاہتے ہیں کہ انتظام مملکت میں ان کی آواز فیصلہ کن قرار دی جائے کیونکہ یہ اپنے آپ کو شریعت یا قانون الٰہی کے ٹھیکیدار قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کی حکومت تو صرف ایک گروہ خاص کی حکومت ہوگی جس طرح دورِ اسرائیلہ میں علماء بنی اسرائیل کی تھی اور جو قرآنی رُوح اور منشار کے صریحاً منافی ہے۔ اس خیال سے کہ ایک طرف مذہبی پیشواؤں کو

اور نزاعی فرقوں نے اپنی تکرار اور دعووں کی حمایت میں گھڑ لیا تھا اور بہ آسانی انہیں رسول کریم سے منسوب کر دیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ موقتی احکام کو دوامی اور عالمگیر احکام سے جدا کرنا ہوگا۔ یہی وہ صورت ہے جس سے ہم رسولِ خدا کے قائم کردہ امتِ وسطا کی تنظیم و عمل کے حقیقی خدوخال معلوم کر سکتے ہیں۔

کام یہیں ختم نہیں ہوگا۔ اصلی تصویر کو پہلی حالت میں لے آنے اور عہدِ نبوی کے حقیقی اسلام کو دوبارہ دریافت کرنے کی ساعت ہی وہ صحیح ساعت ہوگی جبکہ جدید دنیا کی پیچیدہ ضروریات کے مطابق ہم اسلامی فکر و خیال کی تنظیمِ نو کر سکیں گے۔ کیونکہ جب تک پہلے یہ تصویر اصلی حالت پہ نہ آجائے تنظیمِ نو کی یہ کوشش ایسی ہی ایک پیوندکاری ہوگی جیسی کہ زمانہ بعید میں ہوئی یا حال میں اجتہاد کی ہر ایک کوشش رہی ہے۔ اس راہ میں جو چیز حائل ہے وہ زنگ ہے جو ادبِ حدیث کے سونے پر تہ بہ تہ چڑھا ہوا ہے اور جس کا بیشتر حصہ اصل میں یہودی، ایرانی، نسطوری یا نوفلاطونی رہا ہے۔ جو ارادتاً پیغمبرؐ سے منسوب کیا گیا۔ اور جس سے ایسے عقائد و اعمال رونما ہوئے جو اصل روحِ قرآنی کے مغائر تھے۔ جبتک کہ اصلی کندن نکال نہ لیا جائیگا اور جبتک کہ قابل ترین افراد جنہیں کم از کم آزاد اسلامی ممالک کی حکومتوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اپنی متفقہ کوششوں سے ادبِ حدیث کا مستند مواد اور اسی قسم کی مستند تفسیرِ قرآنی مرتب نہ کریں۔

رسول خدا کے اسلام کا کھوج لگائیں جس پر راشدین کی طرز حکومت بھی قائم تھی؛ اس کے لئے تو علم دین کے روایاتی ماخذوں اور ابتدائی تاریخ اسلام پر ہمیں بڑی جرارت آمیز تحقیقات اور تنقیحات کرنی پڑیگی۔

ایسی تحقیق ضروری ہے خواہ وہ کسی مقصد کیلئے استعمال کی جائے۔ راشدی طرز حکومت کا پتہ چلانے کے بعد اس کو ایسی شکل دینا ہوگا جو وہ آج فطری ارتقاء کی صورت میں اختیار کرتی، اگر وہ ان حادثات سے دوچار نہ ہوئی ہوتی جن سے وہ مکمل زندگی اختیار کرنے سے پہلے دوچار ہوئی ورنہ ہم ایک ایسی زندگی کی طرف لوٹ جائیں گے جو عہد حاضر کے ڈھانچہ میں خوبی کے ساتھ بیٹھ نہ سکیگی۔ ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ اسلام کے اساسی رجحانات کی روشنی میں آج کی دنیا کے مسائل سے کامیابی کے ساتھ دوچار ہوں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس لبے کو صاف نہ کیا جائے جو مانع علم و نظر ہے۔

لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ یہ وہ کام ہے جسے ساری دنیا کے ایسے اہل علم حضرات کو ملکر اور سر جوڑ کر کرنا ہوگا جن میں یہ ہمت ہو کہ قرآنی تاویلات اور حدیث اور فقہ کے ادب کی از سر نو تحقیق کریں اور اس سنت عرب یا خاص عادات و رسوم عرب سے جو فقہ میں کسی نہ کسی طرح داخل ہو گئی تھیں اُس سنت رسول کو جدا کریں جو سنت اللہ کی روشنی یا اس کی اتباع میں خود رسول اللہ نے واقعتاً عمل فرمایا تھا۔ ان خالص احادیث کو ان موضوع احادیث سے پاک کریں جو ابتدائی دو صدی ہجری میں حریف سیاسی جماعتوں

یہ مسلمانوں کے لئے غور و فکر کا وقت ہے۔ دنیا بنی نوع انسان کیلئے جمہوری نظام تعمیر کرنے کی طرف گامزن ہے ـــــ یہ وہ غایت ہے جس کو قرآن کریم نہایت عزیز رکھتا ہے۔ دنیا نے باوجود ان تمام موانعات کے جو سدّراہ ہیں کرۂ ارض کی نعمتوں کو اجتماعی رنگ دینا شروع کر دیا ہے۔ یہ قرآن عظیم کا دوسرا اصل مقصود ہے! سائنس کی دنیا فطرت کی تمام پوشیدہ قوتوں کو کامل شغف کے ساتھ کھول رہی ہے اور انہیں انسان کی خدمت پر لگا رہی ہے ـــــ اسی کی پکار قرآن کے ہر گوشہ سے بلند ہو کر فضائے عالم میں گونج رہی ہے۔ اس لئے اسلامی ممالک کو جدید دنیا کے نمایاں رجحانات سے ہم دوش ہوتے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہونی چاہیئے۔ اگر وہ اپنے روحانی اساس سے کٹ کر یا قرآن مجید کے نشان دادہ عالی مقصد سے بے نیاز ہو کر اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کے پیچھے پڑیں تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو ساری دنیا کا ہونے والا ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنے اندر اجتماعی طور پر احساس حق پیدا کریں جس کو قرآن زندگی کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور اس پر انتہائی زور دیتا ہے اور اسی طرح انفرادی طور پر بھی اسی احساس حق کو اپنے اندر قوی کریں یا بالفاظ دیگر اگر وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائی پر اپنی کامل توجہ صرف کریں تو اب بھی انہیں امۃ وسطاً کا بلند مقام حاصل ہو سکتا ہے اور وہ آج کی دنیا کی افراط و تفریط کے درمیان میزانِ عدل قائم کر سکتے ہیں!

اس وقت تک اسلامی مذہبی تعلیمات کی تشکیل نو اور ملت کے لئے ایک عام اساسی مقصد کی تاسیس کی کوئی کوشش خاطر خواہ نتائج پیدا نہ کر سکے گی۔

اسلام کو قرون وسطیٰ کے شکنجے سے آزاد کرانے کی منزل طے ہونے تک اور اس کے بعد کسی واحد ثقافتی بنیاد پر ساری مسلم جماعت کی تنظیم ہونے تک ہر ملک کے مسلمانوں سے اگر ان میں آج کے دغدغوں کو سہ لینے اور زندہ رہنے کی تمنا ہے تو کم سے کم توقع جو کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر فکر و عمل میں احساس حق یا احساس انسانیت کو فروغ دیا جائے اور اس اساس پر آج کی دنیا کے جملہ ترقی پسند رجحانات کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اگر ہمیں واقعی روح قرآنی سے فیض و ہدایت مقصود ہے تو انہیں ان رجحانات کو اپنی گرفت میں لا کر انہیں وہ قرآنی چاشنی دینی ہوگی جس کی فی الوقت کمی ہے۔ کیونکہ یہی وہ کمی ہے جس نے ان رجحانات کو جو بصورت دیگر ترقی پذیر ہیں۔ تباہی کے آلات بنا دیا ہے اور ہماری ہی زندگی کے دوران میں دو مہیب اور ہولناک جنگیں پیش کی ہیں۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ چاشنی وقت پر نہ دی گئی تو مستقبل قریب میں انسانیت کے جسم کو ایک اور مہلک گھاؤ لگے گا۔ آخر یہ رجحانات ان کا سرچشمہ کچھ ہی ہو یا دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اقوام انہیں کتنے ہی مختلف مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ حقیقی روح قرآن سے ہم آہنگ ہی ہیں اور اپنی تاریخی ترقی کی بعض منزلوں میں واقعتاً اسکی تعلیمات سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں

کچھ حصہ، بالخصوص وسط ایشیائی علاقہ، پہلے ہی سے روسی اقتدار کے ماتحت آچکا ہے لیکن دوسرے اسلامی ممالک (سوائے ترکی کے) ابھی تک غیر جانبدار ہیں۔ ایک طرف ان کی جغرافیائی پوزیشن کی اہمیت کا یہ عالم ہے لیکن دوسری طرف ان کی اقتصادی پستی کی یہ حالت ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جو مرفہ الحال کہا جاسکے۔ ان ممالک کے عوام افلاس اور جہالت کی تاریکیوں میں غرق کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر کہیں تجدد یا مغربیت کی جھلک نظر آتی ہے تو اول تو وہ صرف خاص خاص طبقوں تک محدود ہے اور پھر (بدقسمتی سے) انہیں بھی اس تہذیب کا نمائشی پہلو ہی پسند آیا۔ ان مایوس کن حالات میں اگر امید کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو یہ کہ اب دنیائے اسلام کے رگ و پے میں ایک سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے جس سے چند نئے انداز کے لیڈروں کی نمود ہوئی ہے۔ یہ لیڈر متنوع ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کو لئے ہوئے سامنے آئے ہیں۔ ان کے سر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان ممالک کے سیاسی شعور کے لئے صحیح راستے متعین کریں۔

ان ممالک کیلئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے قدرتی وسائل پیداوار کو ترقی دیں اور عوام کے اخلاق سنوارنے اور جہالت اور تنگ نظری کو دور کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کرلیا تو یہ ممالک امن عالم کے حصول اور قیام کیلئے ایک موثر قوت

باب ہشتم

پس چہ باید کرد!

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے امکانات کیا ہیں؟ اس کی کیا صورت ہے کہ وہ زمانۂ حاضرہ کے رجحانات کو اچھی طرح سے سمجھ کر اُن کے ساتھ مطابقت پیدا کرلیں؟ دنیا میں مسلمان کوئی مختصر سی جماعت نہیں۔ یہ مختلف جغرافیائی قومیتوں اور ثقافتی طبقوں پر مشتمل، قریب پینتیس چالیس کروڑ نفوس ہوں گے۔ جس سرزمین پر یہ بستے ہیں وہ بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک ایک وسیع و عریض پیٹی کی طرح پھیلی ہوئی ہے جس کی لپیٹ میں افریقہ اور ایشیا کے دونوں براعظم آگئے ہیں۔ اسی میں سے کچھ شاخیں شمال اور جنوب کی طرف نکل گئی ہیں۔ یہ خطہ سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس وقت اینگلو امریکن اور روسی سیاست کی حریفانہ کشاکش کے درمیان بطور حد فاصل واقع ہے۔ اور ہر دو اطراف کے متقابل اثرات کی زد میں بھی ہے۔ اس کا

مسلمانوں کی جغرافیائی پوزیشن

ن سکے۔ یعنی اگر یہ دیکھنا ہو کہ کسی قوم نے مفاد عامہ کے لئے کچھ کیا ہے تو اس
کے پرکھنے کا معیار یہ ہوگا کہ اس نے اپنے ہاں عالمگیر حقوق انسانیت کو
کس حد تک نافذ کیا ہے۔ جنرل اسمبلی کے اس اعلامیہ میں انسانیت کے
بنیادی حقوق ـــــ شہری، سیاسی، اقتصادی، عمرانی، مذہبی اور ثقافتی
حقوق بالتفصیل درج ہیں۔ وہ افراد اور اقوام کو اس کی دعوت دیتا ہے
کہ وہ تعلیم و تدریس کے ذریعہ ان حقوق اور انسانی آزادی کی ذمہ داری
کا احساس عام کریں اور قومی اور بین الاقوامی دونوں قسم کی اصلاحی
تدابیر سے کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی اہمیت کو محسوس
کرنے لگ جائیں، اور ان پر موثر طریق سے عمل پیرا ہوں۔ مختصر الفاظ میں
یوں سمجھئے کہ اس اعلامیہ کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ "ان تمام حقوق
کا مجموعہ ہے جو آج تک دنیا کی اقوام ممالک یا تہذیبوں نے انسان کو دیئے
تھے"۔ اس اعلامیہ کا دوہرا مقصد ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ فرد میں ان صلاحیتوں
کی نمود کر دے جن کی رو سے وہ اپنی طبعی اخلاقی، علمی، ذہنی اور ملی زندگی
میں صحیح آزادی کی زندگی بسر کر سکے۔ اور دوسرے یہ کہ ان افراد میں ایسی
قابلیت پیدا کی جائے کہ وہ امن عالم کے قیام میں پورا پورا حصہ لے سکیں

مسلمان اور بنیادی حقوق کا اعلامیہ

جہاں تک قرآن کے مطالعہ کرنے والے کا تعلق ہے۔ مذکورہ منشور کی
تمہید یا مقاصد کا کوئی لفظ یا بنیادی حقوق کے اعلامیہ کی کوئی شق بھی ایسی

بن جائیں گے اور اس طرح ان توقعات کو پورا کر سکیں گے جو مجلس اقوام متحدہ نے (جس کے ان میں سے بیشتر ممالک رکن ہیں) ان سے وابستہ کر رکھی ہیں لیکن اس مقصد کا حصول دوسرے ممالک سے فنی اور مالی امداد کے بغیر ناممکن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی مدد اس طرح حاصل ہو سکے گی کہ مدد دینے والے ممالک اس امداد کی ڈور سے اپنے سیاسی مفاد کا پتنگ نہ باندھ دیں۔ دوسرے یہ کہ اس امن کی نوعیت کیا ہوگی جس کی مجلس کیلئے مسلم اقوام کو مجلس کے دوسرے ارکان سے تعاون کرنا ہوگا۔

مجلس اقوام متحدہ کا وجود اس منشور کی رُو سے ظہور میں آیا تھا جسے اقوام متحدہ کی کانفرنس اور بین الاقوامی ادارہ نے ۱۹۴۵ء میں سانفرانسسکو کے مقام پر منظور کیا تھا۔ اس منشور کی رُو سے ان اقوام نے جنہوں نے اس مجلس کی رُکنیت قبول کی ہے۔ یہ عہد و پیمان کیا ہے کہ وہ انسانی حقوق اور آزادی کے بنیادی اصولوں کے تحفظ اور نفاذ کے لئے بلا تفریق نسل، زبان اور مذہب پُوری پُوری جدوجہد کریں گے۔ ۱۹۴۸ء میں مجلس کی جنرل اسمبلی نے تیس شقوں پر مشتمل "انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ" منظور کیا۔

عالمگیر حقوقِ انسانیت

تاکہ وہ تمام اقوام و ملل کی حسن کارکردگی کے ناپنے کا پیمانہ

حکومت یا مجلس قانون ساز ہی ان حقوق کے نفاذ کیلئے قدم اُٹھائیگی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان ممالک کا سیاسی نظام ایسا ہے کہ اس کی رُو سے زمام اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہے جن کی نگاہوں میں ان حقوق کا احترام ہو اور جن کے دِلوں میں ان کی تنفیذ کی تڑپ ؟

اور آخری سوال یہ ہے کہ کیا ان دونوں دستاویزات کے پیشِ نظر ایک ایسا نظام عالم ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کے سامنے ایک مشترک مقصد ہو اور وہ مقصد تمام دنیا کے ممالک کیلئے قابل قبول بھی ہو۔ آج دنیا کی جو حالت ہے اس کی رو سے دنیا دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ـــــ ایک طرف روس اور دوسری طرف امریکی کیمپ ـــــ ایک عالمگیر نظام (خواہ اس کی ہیئت کیسی ہی کیوں نہ ہو) اسی وقت ممکن ہوگا جب ان دونوں کیمپوں میں متضاد تصوراتِ زندگی میں مفاہمت کی صورت پیدا ہوسکے۔ یا کم از کم یہ دونوں کیمپ باہمی تعاون کیلئے کوئی بین بین راہ نکال سکیں۔ کیا موجودہ صورت حال میں اس قسم کی مفاہمت کا امکان ہے؟

آئیے ذرا ان سوالات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ عالمگیر حقوق انسانیت کے اعلامیہ کا محرک کونسا جذبہ یا مقصد ہے؟ یہ حقیقت کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ یہ خیال امریکہ سے اُبھرا تھا۔ یہی وہ ملک تھا جو گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد سب سے زیادہ طاقتور ملک کی حیثیت

نہیں جو اُس کیلئے غیر مانوس ہو۔ ایک ایسے مذہبی عقیدہ کے تحت جو انسان کے مقام کو خدا سے نیچے اور ساری کائنات سے اُوپر قرار دیتا ہے اور نسل رنگ اور قبائلی امتیازات کو مٹا کر تمام نوع انسانی کو خدا کا کنبہ بن کر رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ یعنی ایسا کنبہ جس کا ہر فرد دوسرے افراد کیلئے راعی (چرواہے) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ انسانی حقوق کا یہ عالمگیر اعلامیہ قرآن کے بنیادی پروگرام کا لازمی نتیجہ یا اسی کی بڑھی ہوئی شاخ کے مترادف ہے۔ بایں ہمہ۔ یہ حقیقت ہے کہ اقوام متحدہ کی طرف سے ان حقوق کا اعلان نوع انسانی کو اس کے موجودہ مقام سے ایک قدم بھی آگے نہیں لے جاسکتا۔ اسی باب میں قرآنی نقطہ نظر سے چند اہم سوالات سامنے آتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ کہ وہ کونسا جذبہ ہے جو اقوام متحدہ کے منشور یا حقوق انسانی کے اعلامیہ کا محرک ہے۔ بالفاظ دیگر، کیا اس اسکیم کو تمام نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے تصور کے ماتحت مرتب کیا گیا ہے یا اُس سے کسی خاص ملک یا قوم کے مفاد کا تحفظ مقصود ہے؟

دوسرے یہ کہ عالمگیر حقوق کی فہرست کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسوقت دنیائے تہذیب کا کوئی ملک بھی ایسا ہے جسے اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ان حقوق پر اس طرح عمل پیرا ہے کہ اس کے ہاں کا معاشرہ دوسروں کے لئے مثال بن سکے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہر ملک کی

"اگر ہم امریکہ کی خارجی پالیسی کے بنیادی مقاصد، یعنی اپنے ملّی قیام کے تحفظ اور اپنے معاشرہ کی بقاء کا حصول چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم آزاد اقوام کی امداد جاری رکھیں تاکہ وہ روسی اقتدار کو آگے بڑھنے سے روکتی رہیں۔ ہماری ہر وقت یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ روس اور امریکہ کی کشمکش محدود ترین حلقہ کے اندر رہے اور ان دونوں میں فوجی تصادم کی نوبت نہ آنے پائے لیکن یہ مقصد ہمارا قلیل ترین مقصد ہے۔ اتنی سی بات پر نہ تو اقوامِ عالم ہمارے مفاد کے لئے ایک محاذ پر جمع ہوں گی اور نہ ہی اُن پیچیدہ مسائل کے حل کے لئے کوئی متحدہ کارروائی کریں گی جو آج آزاد دنیا کو درپیش ہیں ـــــ اس قسم کے مسائل، جیسے نئی نئی آزاد مملکتوں کا قیام تاکہ ان کے باشندے بہتر زندگی بسر کر سکیں یا بعض علاقوں میں اس قسم کا روز افزوں احساس کہ وہ بین الاقوامی معاملات میں اس نہج سے حصّہ نہیں لے رہے جو ان کے ذرائع یا اُن کی عظیم روحانی خصوصیتوں کے شایانِ شان ہو ـــــ

ہمیں ان قوی محرکات کے چیلنج کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم آزاد اقوام کو پوری پوری امداد دیں تاکہ وہ اپنی تمدنی، اقتصادی اور سیاسی مرفہ الحالی کو آگے بڑھا سکیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے جمہوری اقوام خود اپنی تدریجی

سے سامنے آیا۔ اتنا طاقتور کہ اس کی قوت بہت سی اقوام کی سیاسی پالیسی کو متاثر کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ مذکورۂ بالا اعلامیہ درحقیقت ایک بڑے پروگرام کا جزو ہے۔ جس کا مقصد امن عالم کا قیام ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس امن عالم کی نوعیت کیا ہے؟ جس کے حصول کیلئے یہ سارا پروگرام بنایا جا رہا ہے؟ یہ سوال، انسان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر اس لئے سامنے آتا ہے کہ دنیا کو اس سے پہلے اس قسم کے بلند آہنگ منصوبوں کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ یہ منصوبے اٹھائے تو گئے ان دعاوی کے ساتھ کہ ان سے مقصود نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن آخرالامر ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا میں استعماریت کے شکنجے اور مضبوط ہو گئے۔ لہٰذا موجودہ پروگرام کو دیکھ کر اس قسم کے سوالات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ان سوالات کا جواب بھی امریکہ ہی کو دینا ہوگا۔ اس لئے کہ آج دنیا میں امن عالم کا کوئی فارمولا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک وہ امریکہ کی پالیسی کے موافق نہ ہو۔

اس بارہ میں حکومت امریکہ کے محکمۂ خارجہ کے ایک ذمہ دار رکن کا بیان پیش کیا جاتا ہے جو اس نے مذکورۂ صدر اعلامیہ کی منظوری کے فوری بعد دیا تھا۔ مسٹر جارج میک گھی، اسسٹنٹ سکرٹری امور خارجہ نے انجمن جمہوریہ نوجوانان (Young Democratic Club) کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

۹۰۰ ملین ڈالر والا امداد باہمی کا پروگرام زیر بحث تھا۔ مسٹر ایچی سن نے ہندوستان کے عوامی انتخابات کے نتائج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا:۔

ہمارے وہ نمائندے جو ان انتخابات کے موقع پر خود ہندوستان میں موجود تھے بیک زبان کہتے ہیں کہ اگر نہرو حکومت نے آئندہ پانچ سال میں نمایاں اقتصادی ترقی کا ثبوت نہ دیا تو امکان یہ ہے کہ آئندہ انتخابات میں جمہوری عناصر کو یا تو دائیں بازو کے انتہا پسندوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور یا کمیونسٹوں کا۔ میں پورے اعتماد اور بھروسہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر نہرو گورنمنٹ اپنے ملک کی اقتصادی ترقی کو نمایاں طور پر اہل ملک کے سامنے نہ لائی تو وہ کمیونسٹوں کے خلاف جنگ جیت نہ لے گی۔[۳]

تحفظ خویش:۔ انسان کا جبلی تقاضہ ہے اس لئے امریکہ کی یہ خواہش کہ وہ اپنی قومی صیانت کا تحفظ کرلے۔ بین الاقوامی مفاد کو ناگوار نہیں گزرنا چاہیئے۔ میں تو یہاں تک بھی کہوں گا کہ اگر امریکہ اپنے اس جذبۂ تحفظ خویش کے ساتھ ساتھ دوسری اقوام کی مرفہ الحالی کا خیال رکھتا ہے، بالخصوص پسماندہ اقوام کا تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ امریکہ نے تحفظ خویش کے جذبہ میں انسانیت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ امریکہ کے ارباب حل وعقد کی طرف سے اس قسم کے بیانات جن کے اقتباسات اوپر دیئے جا چکے ہیں، انسان کو یہ محسوس کرنے پر مجبور

ترقی اور تحفظِ ذات کے جذبہ کے ماتحت ہمارے ساتھ رضاکارانہ
تعاون کیلئے تیار ہوسکیں گی اور صرف یہی طریقہ ہے جس سے ہم
اجتماعی امن و سلامتی اور بین الاقوامی ربط و تعاون کو حاصل کرسکیں گے۔
جس پر ہماری مستقبل کی خود مختار قومی زندگی کا انحصار ہے۔"

امریکی مفاد کا تحفظ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس بیان میں کس طرح سارا زور امریکہ کی قومی حفاظت اور اس کی معاشرتی زندگی کی صیانت پر دیا گیا ہے؟ اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہا گیا ہے ــــ یعنی دنیا میں نئی نئی آزاد مملکتوں کی نمود، دوسری اقوام کی مالی امداد تاکہ وہ اپنی تمدنی اقتصادی اور سیاسی مرفہ الحالی کو بڑھا سکیں۔ وغیرہ وغیرہ ــــ یہ سب ذرائع ہیں مذکورۂ بالا ہر دو مقاصد کے حصول کے لئے! اس بیان میں جو دوسری چیز نمایاں طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ امریکہ اس بات کو قطعاً روا نہیں رکھے گا جن اقوام کی وہ امداد کرے وہ غیر جانبدار رہیں۔ وہ ان سے توقع رکھے گا کہ وہ روس کی استعماریت کے خلاف رضاکارانہ طور پر آزاد امریکی محاذ میں شامل رہیں۔

یہ حقیقت کہ دوسری اقوام کو مدد دینے کے معاملہ میں امریکہ کی پالیسی آج بھی مذکورۂ بالا محرکات و مقتضیات ہی کی بنیادوں پر استوار ہے اس بیان سے بھی واضح ہے جو امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر ڈین ایچیسن نے ۱۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو دیا تھا جبکہ ایوانِ نمائندگان میں پریزیڈنٹ ٹرومن کا

میں یہ دونوں نظریہ ہائے حیات باطل ہوں۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ان میں سے ایک باطل کا استیصال اسی صورت میں ممکن ہو کہ یہ ممالک دوسرے باطل سے کامل طور پر ہم آہنگ ہو جائیں؟ حال ہی میں اُس کانفرنس کی کارروائی شائع ہوئی ہے جو مارچ ۱۹۵۱ء میں واشنگٹن کے ادارۂ مشرق وسطیٰ (Middle East Institute) کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اِس کانفرنس میں "زمانہ حاضر میں اسلام" کے عنوان پر متعدد خطبات و مقالات پڑھے گئے۔ یہ مقالات ایک مجموعہ کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ جس کی "تمہید" کے حسب ذیل ٹکڑے سے میں خاص طور پر متاثر ہوا ہوں

> باشندگان امریکہ کیلئے دنیائے اسلام کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ یہ اس لئے کہ (علاوہ اس کے کہ اسلامی ممالک کی جغرافیائی پوزیشن کتنی اہم ہے) یہ خطہ جو اپنے اندر بے پناہ امکانی قوتیں رکھتا ہے ابھی تک اس کشمکش میں غیر جانبدار ہے جو مغربی جمہوریتوں اور روسی کمیونزم اور اس کے زیر اثر ریاستوں کے درمیان جاری ہے۔ متعدد وجوہات کی بنا پر دنیائے اسلام کا میلان جمہوریتوں کی طرف ہے لیکن اس کے باوجود کچھ زبردست اثرات ایسے بھی ہیں جو نہ صرف ان ممالک کی جمہوریتوں کے ساتھ کامل توافق کی راہ میں حائل ہیں، بلکہ انہیں فریق مخالف کے محاذ کی طرف جھکا رہے ہیں۔ اس مسئلہ کا مکمل حل یہی نہیں کہ ہم ان ممالک کی

کر دیتے ہیں کہ دیگر اقوام عالم کی امداد کے یہ تمام اقدامات درحقیقت روس کے خلاف ایک متحدہ محاذ کے قیام کی کوششیں ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر سوچنا یہ ہوگا کہ کیا ان اقوام کے لئے جو امریکہ کی مختلف امدادی اسکیموں سے فائدہ حاصل کرتی ہیں۔ یا اس کے حصول کے لئے آرزومند ہیں۔ اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں رہے گا کہ وہ روسی اقتدار کی توسیع کے خلاف نبرد آزما ہیں اور اس مقصد کیلئے امریکہ کے ممد و معاون بنیں کہ وہ دنیا کو دو مسلح محاذوں میں تقسیم کر رکھے ہے ایک محاذ وہ جس کا مقصد امریکہ کی قومی صیانت اور معیار زندگی کا تحفظ ہو اور دوسرا محاذ وہ جو روسی اقتدار کے زیر اثر رہے۔ امید کہ امریکہ کا فی الحقیقت یہ مقصود ہو۔

اسلام اور کمیونزم اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جو زیادہ غور طلب ہے مختلف ممالک میں اپنے اپنے طور پر کمیونزم کی مخالفت مختلف وجوہات سے ہو سکتی ہے ـــــ خواہ یہ مخالفت امریکہ کے تعاون کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر، لیکن کیا یہ ضرور ہے کہ اس باب میں جن ممالک کو امریکہ کا تعاون حاصل ہو ان کے لئے یہ ناگزیر ہو کہ وہ امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظریۂ حیات سے بھی ہم آہنگی اختیار کریں؟ مثلاً اسلامی ممالک کو لیجئے۔ ان پر ایک طرف سے کمیونزم کا دباؤ پڑ رہا ہے ـــــ اور دوسری طرف سے سرمایہ داری کا۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی نظام بھی اپنی موجودہ شکل میں قابل قبول نہ ہو۔ انکی نگاہوں

سے جو اسلامی تصورِ زندگی سے متضاد ہوں) تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بہت بڑے فریب میں مبتلا ہیں۔ یہ تو حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک جمہوریت اور ان عالمگیر اقدارِ حیات کا تعلق ہے جن کا اظہار "انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ" میں کیا گیا ہے، مسلمان (ان مقاصد کے حصول کے لئے) بڑی جانفشانی سے مصروفِ جدوجہد ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ مقاصد اس دور میں خود اسلام کے بنیادی مقتضیات کے ضمن میں آجاتے ہیں۔ لیکن اُن کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ مغرب کے ان اقدارِ حیات کو اپنا لیں جو وہاں سے چل کر اس وقت تک مشرق میں پہنچ چکے ہیں۔ مشرق کا ان اقدارِ حیات سے تعارف، مغربی استعماریت اور ملوکیت کی گوناگوں شکلوں کی رو سے ہوا ہے۔ اور اس استعماریت و ملوکیت کا جسقدر تلخ تجربہ شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کو ہوا ہے دنیا کے کسی دوسرے ملک کو ایسا تجربہ نہ ہوا ہوگا۔ پروفیسر حتی (Hitti) کے الفاظ ہیں:-

> بدقسمتی سے گذشتہ دس بیس برس کے عرصے میں مغرب کا مشرق سے ہر رابطہ خوشگوار نہیں رہا۔ ہمارے مشنریوں، معلموں اور مبلغوں کے انسانیت ساز دعاوی اور فرنگی اور امریکی مدبروں اور فوجیوں کے انسانیت سوز طرزِ عمل میں زمین اور آسمان کا تفاوت کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ قول و فعل کا اس قدر

اقتصادی پستی کو دور کردیں۔ اس کا حل سوچنے میں ہمیں اس بنیادی تضاد کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جو مغربی جمہوریتوں اور دنیائے اسلام کے نظریہ حیات میں ہے۔ مغرب اس باب میں اسی صورت میں کامیاب ہوسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو یقین دلادے کہ جن اقدار کا وہ حامل ہے وہ ایک بہتر زندگی کی دلیل راہ ہیں۔

مغرب کے تقاضے اس سے ظاہر ہے کہ اس "تمہید" کا مصنف اس سے بالکل مطمئن نہ ہوگا کہ مسلم اقوام اپنے اقتصادی معیار کو بلند کرکے اشتراکیت کی دعوت کو مسترد کردیں۔ مغرب کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ممالک اس کے ساتھ پوری پوری ہم آہنگی اختیار کرلیں ـــــ اپنی انفرادیت اور تشخص کو قائم رکھتے ہوئے نہیں بلکہ مغربی اقدار حیات کو بالکلیہ قبول کرتے ہوئے۔ اس قسم کی تدابیر کی محرک آرزوئیں کتنی ہی نیک کیوں نہ ہوں، یہ مسلمانوں کی نفسیات اور ان کی روایاتی خصوصیات کو یکسر نظر انداز کرتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس سے کسی ملک کی غربت اور افلاس کا علاج ہوجاتا ہو تو وہ یقیناً کمیونزم کے خلاف محاذ قائم کرنے پر آمادہ ہوجائے گا۔ اس حد تک تو مسلمان آسانی سے مغربی ممالک کا ساتھ دے سکتے ہیں لیکن اگر مغربی اقوام یہ سمجھتی ہوں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی اقدار حیات سے ہم آہنگ کرلیں گی (یعنی ان اقدار حیات

کیا جائے۔ اِس لئے کہ مسلمانوں میں ہزار خرابیاں ہوں ـــــ وہ خرابیاں بھی جو ان کی قدامت پرستی کا نتیجہ ہیں یا جو ان میں مغرب کی اندھی تقلید سے پیدا ہو چکی ہیں ـــــ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ قرآن سے تعلق اور حضور رسالتمآبؐ کی ذات سے وابستگی کے احساسات ان کے دِل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے اور کوئی نظریۂ زندگی اور تصورِ حیات اِن کے ہاں نہ بار پا سکتا ہے اور نہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب تک وہ ان کے ان گہرے اور شدید جذبات کی رعایت نہ رکھے۔ اپنی تہذیب و ثقافت کے ان سرچشموں کے ساتھ جذبۂ وفا شعاری ہی وہ بنیاد ہے جس پر اُن کی سیاسیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور کوئی قوم انہیں اپنا طرفدار نہیں بنا سکتی جب تک وہ اُن کے ہاں اس دروازے سے داخل نہ ہو۔

ترکی اور اِسلام کہا جا سکتا ہے کہ ترک بھی تو مسلمان ہی ہیں۔ وہ اِس طرح یکسر مغرب پرست کیوں بن گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اِس مغرب زدگی کا باعث ان کا وہ ذہنی بحران تھا جو بیحد نامساعد حالات کے مجموعی اثرات کی وجہ سے پیدا ہو اتھا انہوں نے ۱۹۲۴ء میں الغائے خلافت کا فیصلہ کیا جو صدیوں سے مسلمانانِ عالم میں کسی نہ کسی رنگ میں رشتۂ وحدت کا موجب بنے چلے آ رہی تھی۔ اِسی سال انہوں نے وزارت امورِ مذہبی کو منسوخ اور شرعی عدالتوں کو

کھلا ہوا تضاد؟ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے ساری اہمیت اپنے قومی اور اقتصادی اقدار ہی کو دی ہے۔ ذرا سوچئے کہ ہماری نام نہاد ترقی یافتہ اقوام نے گذشتہ دو مہیب جنگوں میں جن کی تباہیوں کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی، جو وطیرہ اختیار کیا۔ جس بے دردی سے انہوں نے بربادی اور سفاکی کی۔ اُن تمام قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیا جو ان کی سائنس اور مشینوں کی پیداوار ہیں اور جن سے دُنیا کی عافیت ابھی تک خطرے میں ہے۔ پھر امریکہ برطانیہ اور فرانس اور دیگر اقوام عالم نے جو طرزِ عمل فلسطین کے مسئلہ میں اختیار کیا۔ ان تمام حرکات کے مجموعی اثر نے مشرقِ وسطیٰ کے اُن مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی ہیں جو اقوام مغرب سے ذہنی روابط قائم کرنا چاہتے تھے۔ مغرب کی ان ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے رہنے والے اُن سے اس طرح اظہارِ بیگانگی کر رہے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے اب ان لوگوں کا مغربی انسان کے کیرکٹر، اور ذاتی اور سیاسی دونوں سطحوں پر اُس کے اخلاق پر اعتماد نہیں رہا۔[۳]

لہٰذا اگر اہلِ مغرب چاہتے ہیں کہ ان ممالک کے مسلمان جمہوریت اور امنِ عالم کے قیام کے لئے ایک موثر قوت بن جائیں تو اُس کے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ ان مقاصد کو ان کے اپنے اقدارِ حیات سے ہم آہنگ

کا تعلق تھا، ترک عوام اپنے لیڈروں کے ساتھ آخری حد تک جا سکتے تھے (اور وہ درحقیقت آخری حد تک گئے بھی) یہ تحریک انہیں کبھی ناگوار نہیں گذر سکتی تھی کیونکہ یہ اسلامی روایات کے عین مطابق تھی لیکن جہاں تک مذہب کا تعلق تھا وہ اپنے لیڈروں کا ساتھ برضا و رغبت اس حد تک کبھی نہیں دے سکتے تھے جس حد تک وہ (لیڈر) جانا چاہتے تھے۔ اگر تجدید مذہب سے مقصود یہ ہوتا کہ اسلام کو ان زنجیروں سے آزاد کیا جائے جن میں ازمنۂ وسطیٰ (کے دور استبداد و تقلید) نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ اور ان کی بجائے قرآنی اقدار کو نافذ کیا جائے، تو اجتہاد کی اس انقلابی مہم میں ترکی تمام عالم اسلامی کی قیادت کرتا۔ اس انقلاب عظیم کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلامی ممالک میں مغربی استعماریت اور مفاد پرستیوں کی روک تھام ہو جاتی اور دنیا قرآن کے اس اقتصادی نظام سے روشناس ہو جاتی، جس میں دولت کی فراوانیاں وہ انسانیت سوز چنگاریاں پیدا نہیں کر سکتیں جن سے کمیونزم کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔

ترکی کیلئے یہ سب کچھ ممکن تھا جب اس نے ۱۹۲۴ء میں جمہوریت کا اعلان کیا ہے اس وقت دنیائے اسلام میں اس کی ابھی اتنی ساکھ باقی تھی لیکن اس کے ارباب بست و کشاد نے ایسا زرین موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ انہوں نے تجدید مذہب کے شوق میں جس کا بدقسمتی سے ان میں نہ کوئی ذہنی اعتبار سے اہل تھا نہ قلبی اعتبار سے مذہب کے ظواہر کو اپنا

بند کر دیا۔ اُس کے بعد انہوں نے اپنے ضوابطِ قانون بدل ڈالے اور دینیات کے مدارس بند کر دیئے۔ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے رومی ٹوپی کو سر سے اتار پھینکا۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے اتاترک کا پہلا مجسمہ نصب کیا اور ۱۹۲۸ء میں اپنے دستور مملکت سے ان شقوں کو حذف کر دیا جن میں یہ لکھا تھا کہ ترکی کا مملکتی مذہب اسلام ہے۔ اس کے دوسرے سال مذہبی تعلیم کو بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات بند کیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں جبہ و عمامہ کو ممنوع قرار دیا گیا۔ اور ۱۹۳۷ء میں اس کا اعلان کیا گیا کہ ترکی کا آئین غیر مذہبی (Secular) ہے۔ اس طرح انہوں نے سرکاری طور پر مذہب سے اپنا تعلق یکسر منقطع کر لیا۔

لیکن کیا اس سے اسلام بھی ترکی سے جلاوطن ہو گیا اور ترکوں نے اس کی ضرورت کو محسوس کرنا چھوڑ دیا؟ جن لوگوں نے ان تبدیلیوں کا سطحی نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ ان ظواہر سے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ لیکن جن نگاہوں نے سطح سے نیچے اتر کر دیکھا ہے انہوں نے محسوس کیا ہے کہ ترکوں کے دل کی گہرائیوں میں مذہب کی محبت اسی طرح موج زن ہے۔ ترکی کے نئے حاکموں نے اپنے شوق تجدد میں چاہا کہ مذہب کو بھی جدید قالب میں ڈھال لیا جائے لیکن ان کا طریق کار بھونڈا تھا۔ جہاں تک مملکت کو جمہوری رنگ میں رنگنے

مطالبات کے پیش نظر کچھ مذہبی مراعات دی گئی ہیں۔ سب سے پہلی رعایت محدود شکل میں مذہبی تعلیم کا اجرا ہے۔ شروع میں یہ خیال تھا کہ چوتھے اور پانچویں درجے میں مذہبی تعلیم کو اختیاری قرار دیا جائے اور اس میں صرف وہی طالب علم شریک ہو سکیں جو اپنے والدین سے اجازت نامہ لائیں۔ یہ تعلیم مدرسہ کے اوقات کے بعد دی جائے۔ ارباب حل وعقد کا منشاء یہ تھا کہ (اس طریق کار میں) ایسی احتیاط برتی جائے کہ مذہبی تعلیم پھر سے اس قدامت پرست طبقہ کے ہاتھ میں نہ جانے پائے جو جمہوریت کی اصلاحات کے بجائے قدیم شرعی قوانین کو لاگو کرنا رائج کردے۔ اس سال سے مذہبی تعلیم کو جبری قرار دیدیا گیا ہے اور جو والدین اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم سے الگ رکھنا چاہیں اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے لئے اجازت حاصل کریں۔

دوسری رعایت یہ دی گئی ہے کہ جامعہ انقرہ میں دینیات کا شعبہ کھول دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شعبہ جدید سائنٹفک انداز کا ہوگا۔ اس مقصد کیلئے ضروری ہوگا کہ طالب علموں کو مختلف مذاہب کا متقابل مطالعہ کرایا جائے اور (مذہبی کتابوں کے) متن اور اسناد پر تنقید کی اجازت دی جائے۔ اگر یہ کچھ اسی طرح ہوا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس شعبہ دینیات کو اُس قسم کی مشکلات

تختۂ مشق بنایا۔ گویا ان کے نزدیک، مذہب نام تھا فقط ان شعائر و رسومات کا جن کے بدلنے سے (انہوں نے سمجھ لیا کہ) اسلام کی تجدید ہو جائیگی۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے نماز کی شکل بدل ڈالی۔ انہوں نے (تجدید مذہب کے لئے) جو کمیٹی ۱۹۳۰ء میں مقرر کی تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ اگر کچھ سوجھا تو اتنا کہ نماز، ترکی زبان میں پڑھی جائے اور اس کے لئے (زبانی پڑھنے کی بجائے) لکھے ہوئے کاغذ سامنے رکھ لئے جائیں۔ قدیم اور جدید دونوں قسم کی موسیقی، صوتی اور مزامیری، رائج کی جائے تبلیغی مشن۔ جدید طرز کے منبر۔ لباس کے کمرے اور صاف جوتوں سمیت مسجد میں آنے کی اجازت وغیرہ وغیرہ۔ یہ تھیں اس کمیٹی کی سفارشات لیکن اس کمیٹی کو جلد ہی توڑ دینا پڑا۔ اس لئے کہ ترکوں کو منہاج نبوت کے ساتھ جو قلبی تعلق تھا اس کی وجہ سے وہ اس قسم کی بدعتوں کو کبھی پسند نہیں کر سکتے تھے۔ اور نہ ہی اس جدید راستے پر گامزن ہو سکتے تھے۔ اس کمیٹی کی برطرفی درحقیقت پیش خیمہ تھی۔ (تجدد مذہب کے خلاف) اس ردعمل کا جو وہاں اب پورے طور پر نمودار ہو چکا ہے۔ اس باب میں مسٹر جون کنگسلے برج جو استنبول میں امریکی کمشنر اطلاعات رہے ہیں لکھتے ہیں :-

گذشتہ چند سالوں میں ترکوں کا رجحان بالکل سمتِ مخالف کی طرف ہو گیا ہے۔ حال ہی میں قدامت پرست رہنماؤں کے

فکر کو قرآنی بنیادوں پر از سرِ نو تشکیل دیں تاکہ اس سے دورِ حاضر کے پیچیدہ تقاضے پورے ہوسکیں۔ اگر انہوں نے اپنی اس کوشش میں اتنی جراءت سے کام لیا کہ وہ مروجہ مذہبی عقائد و تصورات کے متن اور تاریخی اسناد کو تنقیدی نگاہ سے پرکھ کر دیکھ لیں (کہ ان میں سے کون کونسا اسلام کے اصل سرچشمہ کے مطابق ہے اور کونسا بعد کا وضع کردہ) جس طرح (مسٹر کنگسلے کے خیال کے مطابق) انقرہ کے شعبۂ دینیات کو کرنا ہوگا تو اس سے اسلام کو بیش بہا فائدہ پہنچے گا۔ اگر (جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس کا مشورہ دیا ہے) یہ کام مسلمانانِ عالم کی باہمی مشاورت سے اجتماعی انداز میں کیا گیا تو اس سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کیلئے ایک مشترکہ ضابطۂ فقہ مرتب ہوجائے اور اس مشترکہ فقہ کی طرف خود ترکی بھی پلٹ آئے۔ اگر کہیں ایک مرتبہ بھی ایسا ہوگیا کہ ہمارے مذہبی ذخائر میں سے) سونا اور کھوٹ الگ الگ ہوجائیں (یعنی قرآن کا حقیقی اسلام بعد کے وضع کردہ عجمی اسلام سے نتھر کر الگ ہوجائے) اور اس طرح مسلمان کا رشتہ پھر سے اس کے اصل سرچشمۂ حیات سے جڑ گیا تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی دنیا بلا توقف و تامل مغربی جمہوریت کی ہر وہ چیز قبول کرلے گی جو قرآن کے مطابق ہوگی اور اس کے بدلے میں مغرب کو وہ کچھ دے سکے گی جس سے وہ اس وقت تک محروم ہے اور جس سے اس کے جمہوری تصورات

کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جو معتدل عیسائیوں کے علمبرداروں کو پچھلی صدی میں پیش آئی تھیں؟

اس کے بعد مسٹر کنگسلے لکھتا ہے:

گذشتہ سال تک اگرچہ کہ قانوناً ضروری تھا کہ اذان ترکی زبان میں دی جائے لیکن اس پر عمل درآمد کبھی نہ ہو سکا۔ اب اذان عربی زبان ہی میں دی جاتی ہے۔ مجھے ابھی تک کوئی ترک ایسا نہیں ملا جو قرآن کو ترکی زبان میں پڑھنا پسند کرتا ہو۔ قرآن ابھی تک عربی ہی میں پڑھا جاتا ہے۔ بغیر ترجمہ یا تفسیر کے قرآن کے عربی الفاظ دہرائے جاتے ہیں جن کا مطلب کوئی ترک نہیں سمجھتا لیکن اس کے باوجود قرآن کے یہ عربی الفاظ ان کے دلوں میں گرم جوشی پیدا کر دیتے ہیں۔

میں نے ترکی کی مثال یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے کہ جس ملک کے مدبرین نے پورے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ انہیں یکسر مغرب کے رنگ میں رنگے جانا چاہیئے، وہاں کے عوام بھی اس پر آمادہ نہ ہو سکے کہ وہ اپنی ثقافتی روایات کو نگاہوں سے اوجھل ہو جانے دیں۔ اس

اسلام کی صحیح تجدید

وقت صورتِ حالات یہ ہے کہ قریب قریب ہر اسلامی ملک کے ارباب فکر و نظر سوچ رہے ہیں کہ وہ مذہبی قدامت پرستی کو برضا و رغبت خیرباد کہہ دیں اور اپنی تمدنی

کوئی نمایاں قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس دوران میں ایک کمیشن ضرور متعین کیا گیا تھا کہ وہ "انسانی حقوق" کی ترویج و تنفیذ کے لئے اسباب و ذرائع پر غور کرے لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر کمیشن کی مساعی ابھی تک بارآور نہیں ہو سکیں۔ اس جمود کے لئے کہیں یہ کہدیا جاتا ہے کہ کوریا کی جنگ اور جنوب مشرقی علاقوں میں فوجی نقل و حرکت ان "حقوق" کے عام ہونے کی راہ میں حائل ہو گئیں اور کہیں اس کا ذمہ دار مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے مسائل کو قرار دیا جاتا ہے جن کی وجہ سے بین الاقوامی کشاکش زیادہ تیز ہو گئی۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ مختلف ممالک نے اپنے اپنے ہاں جو حفاظتی تدابیر اختیار کر رکھیں ہیں ان کی وجہ سے انسانی آزادی کے عام ہونے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن اس کا اصل سبب ان بیان کردہ وجوہات سے کہیں گہرا ہے۔ اسے میسو کیاسان (M. Rene Cassin) کے الفاظ میں سنئے جو اقوام متحدہ کے "انسانی حقوق" کے اس کمیشن کے نائب صدر تھے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

> سب سے پہلی دشواری یہ ہے کہ اس "اعلامیہ" میں جو حقوق اور آزادیاں درج ہیں۔ انہیں قانونی حیثیت دی جائے تاکہ اُن کی تکمیل سب پر قانوناً واجب ہو جائے۔ دوسری دشواری اس امر کا فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کونسا ادارہ ہو گا جو اس بات کی

اور اقتصادی بنیادوں میں ایک روحانی انقلاب برپا ہوگا۔ اگر امریکہ چاہتا ہے کہ کمیونزم اسلامی ممالک میں نہ پھیلے تو وہ آگے اور مسلمانوں کے اقتصادی معیار کو بلند کرنے میں نہایت نیک نیتی سے ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن اس سے آگے ان کے معاملات میں قطعاً دخل نہ دے۔ اس لئے کہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کوشش کرنا کہ مسلمان مغربی اقدارِ حیات کو بھی اپنالیں نہ صرف دشوار گذار راستہ ہے بلکہ آخر الامر سخت نقصان کا موجب بھی۔ راہِ صواب صرف یہ ہے کہ دنیا کی آزاد قوموں کو ان ہمہ گیر اقدار کی طرف مائل کیا جائے جو "انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ" میں درج ہیں اور جنہیں قبول کرنے کا وہ پہلے ہی اقرار کر چکے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کا طریقہ یہ نہیں کہ اپنے حریف متقابل (روس) کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی اسکیمیں بناتے چلے جائیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کی جائے۔ کامیابی کی راہ تطہیرِ نفس کے سوا اور کوئی نہیں۔

عملاً کچھ نہیں ہوا چھ سال کا عرصہ ہوگیا۔ جب "اقوام متحدہ کے منشور" پر دستخط ہوئے تھے اور تین سال ہونے کو آئے جب اقوام عالم نے "انسانی حقوق کے اعلامیہ" کی تائید کی تھی لیکن اس تمام عرصے میں ان دستاویزات کی دفعات کو عملاً نافذ کرنے اور ابن آدم کو طبعی، اخلاقی اور ذہنی آزادی سے ہمکنار کرنے کے سلسلے میں

مجلس اقوام کے سامنے آج یہی اور اسی نہج کی دوسری مشکلات ہیں۔ ان کا حل کس حد تک ممکن ہے؟ صرف اس حد تک کہ مختلف آزاد، خود مختار مملکتیں نوعِ انسانی کے حقوق کی عالمگیر ترقی کی خاطر اپنی "خود مختاری" سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہوں تاکہ اس سے ایک محکم نظام عالم قائم ہو سکے یعنی قرآنی تصور کے مطابق یہ مملکتیں اپنی "ارضی" خود مختاری کو اس خدا کے حوالے کر دیں جسے فرمانروائی کا حقیقی حق حاصل ہے! در خود ایک ایسی برادری کی طرح مل جل کر رہیں جس میں ہر فرد دوسرے کے حقوق کا نگہبان (راعی۔ چرواہا) ہو۔ ان مفاد پرستیوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو آجکل دنیا کی جمہوری حکومتوں کا مطمح نگاہ رہی ہیں اور ان انسانوں کی سیرت و کردار کو دیکھتے ہوئے جو ان مملکتوں میں انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آجاتے ہیں۔ یہ کہنا آسان نہیں کہ ان حکومتوں کی طرف سے اس سوال کا صحیح جواب بروقت مل سکے گا۔ (اور وہ نوعِ انسانی کے مفادِ کلی کی خاطر اپنے اپنی فرمانروائی پر خود ہی پابندیاں عائد کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی)

صحیح راستہ

اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں اس مشکل کا حل کیا ہے؟

کرنے کا کام

جب تک اینگلو امریکی بلاک کے سر پر یہ ہوّا سوار ہے کہ کمیونزم دن بدن بڑھتا جا رہا ہے یا وہ بلاک اس پالیسی کو اپنے لئے مفید سمجھتا ہے کہ اشتراکی بھوت کے بھیانک تصور کو زندہ رکھنا چاہیئے اور وہ

نگرانی کرے گا کہ کس ملک نے ان حقوق کی عملی تنقید میں کس قدر ترقی کی ہے۔ نیز جو ان شکایات کو سننے کا مجاز ہوگا کہ جو ایک ملک دوسرے ملک کے خلاف اس بارے میں کرے کہ اُس نے ان حقوق کی اس طرح خلاف ورزی کی ہے۔ تیسری دشواری یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی کمیٹی مقرر کی جائے جو ان حقوق کی خلاف ورزی کے مقدمات کی اپیلیں سُن سکے تو اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ اپیل کا حق کس کس کو حاصل ہوگا یعنی کیا صرف ان مملکتوں کو اپیل کا حق ہوگا جنہوں نے ان "حقوق" کو تسلیم کر لیا ہے یا افراد کو (ان کی حکومتوں کے خلاف) بھی حق مرافعہ حاصل ہوگا۔ نیز غیر حکومتی اداروں کو بھی؟ اس نقطہ کی اہمیت کا اندازہ بآسانی لگ سکتا ہے۔ اس کمیٹی کے سامنے دو سوال ہونگے یعنی یا تو مروجہ پامال طریقے علیٰ حالہٖ رہنے دیئے جائیں جن کی رُو سے کسی فرد کو حق حاصل نہیں کہ اپنی حکومت کے خلاف کسی خارجی عدالت میں اپیل کر سکے) یا پھر عدالتی ضوابط میں اس قسم کی انقلابی تبدیلیاں کی جائیں کہ جہاں کسی مملکت کی رعایا کا کوئی فرد سمجھے کہ اس کا کوئی حق تلف کیا گیا ہے۔ وہ اپنی حکومت کے اس فیصلے کے خلاف کسی بین الاقوامی ادارہ میں اپیل کر سکے۔[۵]

زندگی کی طرف مائل کر لے گی جس سے وہ کمیونزم کے اندر محروم ہے۔

کمیونزم کا نظریہ درحقیقت بھوک کا مسئلہ ہے بھوک اور احتیاج کا مارا ہوا انسان ہر اس چیز کو گوارا کر لیتا ہے جو اسے ان بلاؤں سے فوری نجات دیدے۔ لیکن جونہی بھوک کی تسکین ہوئی اور طبعی ضروریات کا دباؤ کم ہوا، انسانی فطرت جس کی نشوونما کا انحصار صرف روٹی پر نہیں اپنی تسکین کیلئے

روٹی کے بعد

کسی اور چیز کی طالب ہو جائے گی۔ یہ "اور چیز" لامحالہ روحانی قسم کی ہوگی۔ فطرتِ انسانی کو اس کی طلب ہوگی اور ضرور ہوگی۔ آزاد دنیا کے لئے وہ وقت ایسا ہوگا کہ وہ (ان انسانوں سے ٹوٹے ہوئے) قدیم تعلقات کے رشتوں کی تجدید کرے اور انہیں محکم بنیادوں پر استوار کرلے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اس دوران میں وہ خود اپنی زندگی کو نئے قالب میں ڈھال لے اور اپنی مادی ضروریات اور زندگی کے بلند تقاضوں میں توازن قائم کرنے اور اس نئے قالب کو کمیونسٹ دنیا کے سامنے بطور مثال پیش کرے۔ تاکہ وہ بھی اس کی تقلید کرنے لگے۔ یہ ہے دنیا میں وحدت قائم کرنے کا صحیح طریقہ۔ حلقہ بندیوں سے دنیا میں کبھی وحدت قائم نہ ہو سکے گی۔ یہ یقینی امر ہے کہ روس ایک نہ ایک دن اپنی مادی آسائشوں کی حرارت سے تنگ آکر روح کے تقاضوں کی طرف متوجہ ہوگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی اس رجعت الی اللہ کا انداز کیا ہوگا۔ اس کے متعلق حتمی طور پر صرف مستقبل ہی بتا سکے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جوں جوں وقت گذرتا جائے

اپنی تمام قوتوں کو اس مقصد کیلئے وقف کئے ہوئے ہے کہ زیادہ سے زیادہ قوموں کو اپنا دوست بنایا جائے تاکہ روس کے خلاف جنگ لڑی جائے۔ ان دونوں محاذوں کا تصادم روز بروز شدید ہوتا جائے گا اور نوع انسانی ایکدوسرے کے خلاف شمشیر بکف رہے گی۔ اگر اس بلاک کا مقصد یہ ہے کہ ایک عام انسان کو کس طرح کمیونزم کے اثر سے دور رکھا جائے تو اس کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس (انسان) کے سامنے اس نسخے کا نعم البدل پیش کیا جائے جسے روس اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور جس میں اُسے اپنے افلاس اور مصائب کا علاج دکھائی دیتا ہے۔ کمیونزم کا سیلاب صرف اس طریقہ سے رک سکے گا ایک عام انسان کی یہ خواہش تو ہوتی نہیں کہ اسے (رولز رائس (موٹر کار) ملنی چاہئے۔ اگر اسے اُس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی میسر ہوتی رہیں تو وہ اس کا خیال تک بھی نہیں کرے گا کہ دوسروں کو اس قدر فراواں سامانِ زیست کیوں مل رہا ہے۔ یہ بنیادی ضروریاتِ زندگی بہرکیف "خدا کی زمین" بہم پہنچا دیگی بشرطیکہ وہ حکومتیں جنہوں نے "حقوق انسانی کے اعلامیہ" پر دستخط کئے ہیں ایک دوسرے کی طرف دستِ تعاون بڑھائیں اور نیک نیتی سے ان ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کا تہیہ کریں۔ اگر یہ نام نہاد "آزاد دنیا" زندگی کو اسطرح نئے سانچوں میں ڈھال لے کہ اس میں ایک عام انسان کیلئے دلکشی پیدا ہو جائے تو اس عملی مثال کی قوت سے وہ نہ صرف آزاد دنیا میں کمیونزم کی توسیع کو روک دیگی بلکہ خود کمیونسٹ خطہ کے انسان کو ایک ایسی

کمیونزم کے اصولوں کی روشنی میں خود اپنے نظامِ زندگی کی ناہمواریوں کو دور کریں تاکہ روسی کمیونسٹ بھی آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کر سکیں اس قسم کی باہمی مفاہمت میں پیشقدمی کرنے کے لئے اسٹالین کی اس تجویز پر وسعتِ نظر کیساتھ غور کرنا چاہیئے جس میں اس نے کہا ہے کہ ہمیں دنیا میں اس طرح رہنا چاہیئے کہ خود بھی جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ اس مفاہمت سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ہوگا کہ دنیا کو کچھ وقت کیلئے امن نصیب ہو جائیگا اور دونوں کو اس کا موقع مل جائے گا کہ وہ اپنی اپنی حالت کا جائزہ لیں اور اپنی اپنی اصلاح کریں۔ اسٹالین کی مذکورہ صدر تجویز یوں سامنے آئی تھی کہ چند امریکی اخبار اور ریڈیو ایڈیٹروں نے اُس سے پوچھا کہ وہ بنیاد کونسی ہے جس سے سرمایہ داری نظام اور کمیونزم دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں اسٹالین نے کہا کہ

> اس کا امکان ہے کہ نظام سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں پُرامن طریقہ سے ساتھ ساتھ رہ سکیں بشرطیکہ دونوں گروہوں کے دل میں تعاون کی خواہش ہو۔ وہ دونوں عہد و پیمان کی پابندی پر آمادگی ظاہر کریں اور اس کے لئے تیار ہوں کہ تمام مملکتوں کو مساوی حیثیت دی جائے اور کسی مملکت کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔[1]

اس میں شبہ نہیں کہ اس تجویز سے بدیہی مقصود تو اتنا ہی تھا کہ دونوں گروہوں میں

---

[1] یہ کتاب اسوقت لکھی گئی تھی جب ہنوز اسٹالین زندہ تھا۔

ہے، رُوس کی صلابت میں نرمی آتی جا رہی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ رُوس کی مرکزی حکومت نے مشرقی علاقوں کے مسلمانوں کو اجازت دیدی ہے کہ وہ کمیونزم کے اقتصادی نظام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے مذہب پر کاربند رہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روس کی سرکاری پالیسی کچھ ہی کیوں نہ رہی ہو، وہاں اب بھی ایسے مرد اور عورتیں موجود ہیں جن کے دل کی گہرائیوں میں خدا موجود ہے۔ اس کی مثال خود اسٹالین کی زندگی کے واقعہ سے پیش کی جا سکتی ہے جس کا ذکر چرچل نے اپنی توزک کی چوتھی جلد میں کیا ہے۔

رُوس میں خدا

۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ چرچل ماسکو میں اسٹالین سے اتحادی فوجی کارروائی کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ چرچل لکھتا ہے کہ اسٹالین اس اسکیم سے اس درجہ متاثر ہوا کہ وہ اس کی تفصیلات کی گہرائیوں میں جذب ہو گیا اور جب اسکی جاذبیت انتہائی نقطہ پر پہنچی تو وہ بے اختیار پکار اٹھا "خدا اس اسکیم کو کامیاب کرے"۔

یہ واقعہ اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ عوام تو ایک طرف، خدا کا تصور اسٹالین تک کے دل کی گہرائیوں سے بھی نہیں نکل سکا۔ لہٰذا یہ توقع رکھنا بڑی خوش فہمی نہیں ہوگی کہ موجودہ روس کا کمیونسٹ ایک نہ ایک دن زندگی کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنی حالت کا از سر نو جائزہ لے گا اور اپنے اسلوب کے مطابق باقی دنیا کے ساتھ دوش بدوش چل پڑے گا بشرطیکہ وہ لوگ جو آج اپنے مفاد کی خاطر دنیا سے کمیونزم کو ملیامیٹ کرنے کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں۔

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ سارا سماں آرہا ہے جس میں لاکھوں مرد یا عورتیں یا تو صفحۂ ہستی سے مٹائے جا رہے تھے یا معاشر میں ان کا کوئی مقام باقی نہیں رہا تھا۔ یہ سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے اور میں اس کے تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کیے جا رہا ہوں لیکن اس کے بعد وہ نسل آئیگی جو ان مصعوبات اور مصائب سے بالکل ناآشنا ہوگی لیکن اس کے ہاں رزق کی فراوانی ہوگی اور وہ اسٹالین کو دعائیں دیگی۔ مجھے برک کا یہ قول یاد ہے کہ ــــــ "اگر ظلم کے بغیر اصلاحات حاصل نہیں ہو سکتیں تو میں ایسی اصلاحات سے باز آیا" ــــــ یہ اخلاقی اصول بڑا خوش آئند ہے لیکن) آج جبکہ ہمارے چاروں طرف جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اس قسم کے اخلاقی وعظ لاحاصل ہیں۔[1]

اب سوال یہ ہے کہ جن آنے والی نسلوں کے نزدیک کمیونزم کا طرز زندگی بالکل فطری ہوگا اور وہ اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنے کا تہیہ کیے بیٹھے ہوں گی، سرمایہ دار جمہوریتوں کیلئے ان کا مقابلہ کس طرح سے ممکن ہوگا؟ ابھی تو کمیونزم اپنے تجرباتی مراحل میں سے گذر رہی ہے۔ اس لئے اگر اسوقت کوئی ایسا خوشگوار بدل پیدا کر لیا جائے جو کمیونزم اور سرمایہ داری نظام کے درمیان مفاہمت کرا سکے اور جو روئے زمین کے عام انسانوں کے لئے قابل قبول ہو، تو یہ نظریہ ان ہر دو کی جگہ لے سکتا ہے۔ ورنہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو دور حاضرہ کی جمہوریتوں کے

جو تناؤ پیدا ہو گیا ہے اس میں کچھ وقت کے لئے کمی واقع ہو جائے لیکن اس کا بھی تو امکان ہے کہ اس عارضی مفاہمت کو بلند مقاصد کا ذریعہ بنا لیا جائے اور دونوں گروہ اپنے اپنے سیاسی نظریات کی اس طرح تشکیل نو کریں کہ ان میں مستقل مفاہمت کی شکل پیدا ہو جائے۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ کمیونزم درحقیقت اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج ہے جسے مغرب کی صنعت گری نے پیدا کیا ہے۔ اگر سرمایہ داری نظام والے ممالک واقعی چاہتے ہیں کہ وہ سبب دور ہو جائے جس کی بنیاد پر کمیونزم نے یہ صدائے احتجاج بلند کی ہے تو ان کیلئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ انہیں اپنے اقتصادی نظام میں اس انداز کی تبدیلی کرنی ہوگی کہ جس سے دونوں گروہوں کے عوام مطمئن ہو جائیں ورنہ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ وہ طریق عمل جس سے کمیونزم آج زندگی کے خطوط کو متعین کر رہی ہے کیسا ہی

اگر آج مفاہمت نہ ہوئی تو؟

متشدد اور وہ راستہ دور حاضر کے کمیونسٹ کیلئے کتنا ہی دشوار گزار اور صعوبت انگیز کیوں نہ ہو، آنے والی نسلیں جن کے سامنے صرف کمیونزم کے ثمرات و برکات رہی ہوں گے۔ اس طرز زندگی پر اسقدر محکم یقین رکھیں گی کہ کوئی چیز ان کے اس محکم ایمان کو متزلزل نہیں کر سکے گی اشتمالی کاشت کاری کا ذکر کرتے ہوئے، خود چرچل نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

سارے کا سارا سرمایہ صنعت میں لگا رہے ہیں۔"

جب روسی زندگی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہاں کے اقتصادی نظام میں اس قسم کی تبدیلی جائز ہے تو اس کا امکان کیوں نہیں کہ کمیونزم تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ اسی کیپٹل ازم کے دوش بدوش چل سکے گی جس میں اب خود اشتراکی رنگ کی آمیزش ہو رہی ہے۔ اب یہ اقوام متحدہ کا کام ہے کہ وہ ان دونوں مخالف گروہوں کے لیڈروں کو ایک جگہ جمع کرے تاکہ وہ باہمی تعاون کے ذریعہ پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے کی تجاویز سوچ نکالیں۔ جہاں تک رُوس کا تعلق ہے اس امر کے باور کرنے کی کئی وجوہات موجود ہیں کہ وہ موجودہ کشمکش سے نکلنے کی باوقار راہ تلاش کرنے کا خواہشمند ہے۔ جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے گذشتہ اپریل میں بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس جس میں انچاس قوموں کے نمائندے شریک ہوئے تھے بلائی تھی۔ اگر اسکا یہ جذبہ صادق ہے اور اس کیلئے ادھر سے بھی ہاتھ بڑھایا گیا تو یہی چیز دونوں گروہوں میں ایک ایسی امتزاجی کیفیت پیدا کر سکتی ہے جو آخر الامر دنیا کی وحدت کا موجب بن جائے۔

اس چیز کا فیصلہ تو مستقبل ہی کر سکتا ہے کہ یہ آرزو شرمندۂ عمل بھی ہوگی یا نہیں، لیکن اگر حالات کا رخ کبھی بھی اس سمت کو پھرا تو اس امتزاج کیلئے اسلامی ممالک کارِ نمایاں کر سکیں گے بشرطیکہ وہ قرآن کے ان اقتصادی نظریات کی طرف لوٹ آئیں جنہیں انہوں نے اس وقت نہایت بے دردی سے پس پشت ڈال رکھا

قرآن کیا کچھ کر سکتا ہے؟

لیڈر اپنے آنے والے بچوں کیلئے مصائب و نوائب کا اتنا بڑا انبار چھوڑ جائیں گے جن پر قابو پانا اُن بیچاروں کے بس کی بات نہ ہوگی۔

یہ حقیقت ہے کہ روسی کمیونزم میں قابل لحاظ ترمیم کا امکان ہے۔ اس تجربہ سے بھی ظاہر ہے جو چین میں کیا جا رہا ہے۔ یعنی اس چین میں جو یقیناً روس کی طرف جھک چکا ہے۔ اس باب میں مسٹر ایلن وِنگٹن (Alan Winington) رقمطراز ہے۔

آزاد چین میں تمام بنیادی اور کلیدی صنعتیں سرکاری ہیں لیکن خانگی سرمایہ داروں کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور امداد و سرپرستی بھی تاکہ وہ ثانوی صنعتوں کو ترقی دیں اور روزمرہ کی کھپت کی چیزیں تیار کریں۔ وہاں مزدوروں کے اداروں اور کارخانوں کے مالکوں کے درمیان اُجرت کے شرائط طے کی جاتی ہیں اور اُن بنیادوں کا تعین کیا جاتا ہے جو مزدور اور سرمایہ دار دونوں کیلئے نفع بخش ہوں۔ چنانچہ آپ وہاں کسی مزدور کو دیکھئے خواہ وہ کسی سرکاری کارخانے میں ملازم ہو یا خانگی ادارہ میں، وہ آپکو خوش و خرم نظر آئیگا۔ اور پوچھنے پر بتائیگا کہ اب اس کے حالات کیسے اچھے ہیں اور وہ صنعتی ترقی کے لئے ذاتی طور پر کیا کچھ کر رہا ہے۔ مجھے وہاں کے کئی سرمایہ داروں نے بھی بتایا کہ وہ جس قدر اب خوش حال ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے اور وہ حسب استطاعت اپنا

ملکیت اور تجارتی سرمایہ داری کا حامی ہے۔ اس باب میں بھی اسلام مغربی سرمایہ دار جمہوریت اور رُوس کی کمیونزم کے درمیان وسطیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔[۱۲]

قرآن کا اقتصادی نظام

اسلامی اخلاقیاتِ عمرانی کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ تمام نوعِ انسانی امتِ واحدہ ہے۔ یعنی رسولؐ اللہ کے ارشاد کے مطابق تمام انسان عیال اللہ ہیں، ایک گلہ جس میں ہر فرد دوسرے کا راعی یا نگہبان ہے۔[۱۳] اس تصور کے ماتحت ہر قسم کا استحصال ناجائز قرار پاتا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر نوعِ انسانی کی اقتصادی زندگی کی وہ عمارت استوار ہوتی ہے جو قرآن کی مقصود و مطلوب ہے۔

قرآنی نظام کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔[۱۴] اسلام کے نزدیک پیداوار اور تقسیم کا کوئی نقشہ جائز نہیں قرار پاسکتا جب تک وہ اس بنیادی تصور سے مطابقت نہ رکھے۔ انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تمام منفعت بخش اشیاء کو زمین سے حاصل کرے لیکن شرط یہ ہے کہ تمام پیداوار کو ایک جا جمع کر کے اسطرح تقسیم کیا جائے کہ اس سے تمام نوع انسانی کی ضروریات پُوری ہو جائیں۔ یعنی اس پیداوار سے صرف وہی لوگ استفادہ نہ کریں جنہوں نے اس کے حصول کیلئے محنت کی ہے۔ اس سے وہ بھی فائدہ حاصل کریں جو کسی نہ کسی وجہ سے محنت اور مشقت سے معذور ہو چکے ہوں۔ تقسیم پیداوار کی

ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں قرآن کے ان نظریات نے اس زمانے کی متخاصم اقتصادی قوتوں کے درمیان امتزاج پیدا کر دیا تھا۔ یہ متخاصم قوتیں وہی تھیں جو آج کیپٹل ازم اور کمیونزم کی شکل میں موجود ہیں۔ اگر ہمارے اسلامی ممالک نے اور کچھ نہ بھی کیا تو کم از کم وہ اتنا تو ضرور کر سکیں گے کہ ان دونوں مخالف گروہوں (روس اور جمہوری ممالک) میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ بن جائیں، جیسا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر گبٹ (Gibb) کا خیال ہے جس نے اسلام کے مطالعہ میں ایک عمر صرف کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> اسلام آج بھی مغربی دنیا کے مبالغہ آمیز متضاد قوتوں میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔ اسلام ہی مغربی نیشنل ازم کی انتہا اور روسی کمیونزم کی جکڑبندی دونوں کا مخالف ہے اور ابھی تک اس اقتصادی ہوّے سے مغلوب نہیں ہوا جو آج یورپ اور روس دونوں کے اعصاب پر بری طرح سوار ہے۔ پروفیسر ماسنو۔ (Massignon) نے اسلام کے عمرانی اخلاقیات کو ان جامع الفاظ میں سمو کر رکھ دیا ہے "اسلام کی یہ خوبی ہے کہ وہ ہر فرد معاشرہ سے مساویانہ حیثیت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قومی محاصل کی تعمیر میں امکان بھر حصہ لے۔ یہ زر کے غیر محدود تبادلے، بنک کے سرمائے، ملکت کے قرضے اور بنیادی ضروریات کی اشیاء پر بالواسطہ ٹیکس کے خلاف ہے لیکن اس کے باوجود یہ والدین اور خاوند کے حقوق۔ ذاتی

کفالت میں دیتا ہے۔ اسلئے کہ یہ خدا کی ذمہ داری ہے کہ جس نے اسے پیدا کیا ہے اُسے رزق بھی پہنچائے[18] اس لئے قرآن ان لوگوں کا، جو رزق پیدا کرنے کی استعداد رکھتے ہیں، یہ فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ مملکت کی طرف منتقل کردیں تاکہ انہیں محتاجوں اور محروموں کی ضروریات پُورا کرنے کیلئے صرف کیا جائے[19]۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے "انفاق فی سبیل اللہ" کہتے ہیں جسے وہ خدا کی محبت کا ثبوت قرار دیتا ہے[20]۔ وہ زکوٰۃ کی ادائیگی پر اس قدر زور دیتا ہے کہ اسکا ذکر صلوٰۃ جیسے مقدس فریضے کے ساتھ کرتا ہے۔ اسکی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ جب خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بعض قبائل نے زکوٰۃ کو مرکزی بیت المال میں بھیجنے سے انکار کردیا تو خلیفہ نے اُن کے خلاف اعلان جہاد کردیا تا آنکہ انہوں نے اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا[21]۔

لہٰذا اسلام میں کمزوروں اور غریبوں کی سرپرستی مملکت کی ذمہ داری ہے۔ قرآن کا نظام یہ ہے کہ ہر فرد معاشرہ کو کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی لازماً بہم پہنچائی جائیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ کے الفاظ میں "ہر انسان کا پیدائشی حق ہے کہ اسکے پاس رہنے کو مکان، ستر ڈھانپنے کو کپڑا، کھانے کو روٹی اور پینے کو پانی ہو"[22]۔ حضورؐ کے اس ارشاد گرامی کا یہی مفہوم ہے کہ مملکت کا کوئی فرد بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کا اسطرح انتظام کرکے جو اپنی روزی آپ نہ پیدا کرسکتے ہوں۔ قرآن اسکی پوری آزادی دیتا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ

یہ شرط اسلام کے اُس تصور کے اندر مضمر ہے جس کی رُو سے تمام نوعِ انسانی کو ایک کنبہ قرار دیا گیا ہے۔

غریبوں کا مسئلہ یعنی ان لوگوں کا مسئلہ جو کبرسنی، بیماری یا کسی اور ایسے ہی سبب سے روزی کمانے کے قابل نہ رہیں، انسانی معاشرہ کا قدیم ترین مسئلہ ہے۔ اسلام سے پہلے اس مسئلہ کا زیادہ سے زیادہ حل یہ سوچا گیا کہ ایسے لوگ امیروں کی خیرات پر گذارہ کریں لیکن اسلام اس قسم کے بےکس و بےبس انسانوں کو گداگری کے ٹکڑوں پر کبھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ ملت کی دولت میں ان کا حق قرار دیتا ہے۔ قرآن بار بار اعلان کرتا ہے کہ جو کچھ زمین سے حاصل کیا جاتا ہے وہ صرف انسانی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں خدا کا ہاتھ بھی شامل ہوتا ہے۔ فطرت کی تمام قوتیں جنہیں انسان اپنے کام میں لاتا ہے خدا کے تعاون کی زندہ شہادتیں ہیں۔ اس اعتبار سے خدا انسان کا شریک کار ہو جاتا ہے بلکہ شریک غالب۔ قرآن کہتا ہے کہ "اے جماعتِ مومنین اگر تم نے خدا کی مدد کی تو خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں دنیا میں ثبات عطا کر دے گا۔"[15] جب خدا انسان کا رفیق کار ٹھہرا تو ظاہر ہے کہ ہر پیداوار میں خدا کا حصہ بھی ہوگا۔ خدا اپنے حصہ کو اُن لوگوں کے لئے وقف کر دیتا ہے جو اپنی روزی آپ کمانے کے قابل نہ ہوں ——— یتامیٰ، بیوائیں، محتاج، مساکین، نادار مسافر اور وہ لوگ جو ہنگامی حوادث کی وجہ سے حصولِ رزق سے محروم ہو چکے ہوں یا وہ جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں اور ایسے مقروض جو ادائیگی قرض کی وسعت نہ رکھتے ہوں۔[16] قرآن ان سب کو خدا کی

ہوتے تھے ـــــ غلام اور آزاد ـــــ غلام وہ ہوتے تھے جنہیں اسیر کرلیا جاتا تھا یا وہ جو اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے اپنی آزادی کو روپیہ کے عوض بیچ دیتے یا رہن رکھدیتے تھے۔ ان بیچاروں کی حالت بڑی خراب تھی۔ رسول اللہ نے سب سے پہلے اپنی توجہ انہی کی طرف مبذول فرمائی۔ اس قسم کی غلامی اس زمانے میں ساری دنیا میں رائج تھی اور عربوں کی اقتصادی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ اس لئے اسے آن واحد میں مٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ لہٰذا رسول اللہ صلعم نے ایسے طریقے اختیار فرمائے جن سے وہ غلام جو اسوقت موجود تھے انسانیت کی سطح پر آجائیں اور آہستہ آہستہ غلامی کا وجود مٹ جائے۔

سب سے پہلے آپ نے غلام کو اپنے آقا کے خاندان کا ایک رکن بنادیا اور اُسے بہت سی رعایتیں دیں جن میں جائداد کا مالک بننے اور آزادی حاصل کرنے کے حقوق بھی شامل ہیں۔ رسول اللہ کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں "جو تمہارے غلام ہوگئے ہیں وہ تمہارے بھائی ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ جو بھی شخص اپنے بھائی پر حاکم اور مقتدر ہو اُسے وہی غذا کھلائے جو خود کھاتا ہے اور اسے وہی لباس پہنائے جو خود پہنتا ہے۔ اس سے ایسا کام نہ لیا جائے جس کو وہ جسمانی حیثیت سے انجام دینے کے قابل نہ ہو اور اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو اس کام میں تم خود اسکی مدد کرو۔" صرف یہی نہیں بلکہ اسکو آزادی دلانے کے ممکنہ ذرائع مہیا کردیئے گئے۔ ہر دولتمند آدمی پر یا جن کے پاس غلام ہوں، یہ حکم عائد کردیا گیا کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی لغزش فروگذاشت پر بطور کفارہ ایک غلام آزاد کرے اور جہاں ایسی فروگذاشتوں کے

دولت پیدا کریں اور تمام جائز طریقوں سے اپنے معیارِ زندگی کو بلند کریں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ روپیہ جمع کرنے کی ممانعت کرتا ہے اور دولت کی آزادانہ گردش کا حکم دیتا ہے[۲۲]۔ ہر فرد معاشرہ پر یہ شرط عائد کرتا ہے کہ معاملات میں کسی دوسرے کی کمزوری سے قطعاً فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ بنابریں قرآن ناجائز نفع اندوزی کے تمام طریقوں کو حرام قرار دیتا ہے اور قمار بازی اور سٹہ کو ممنوع ٹھہراتا ہے لیکن چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر انفرادی یا اجتماعی طریق سے تمام ایسے کاروبار کی اجازت دیتا ہے جو معاشرہ کے مفاد عمومی کے خلاف نہ جائیں۔ اس کے علاوہ استحصال زر کے تقاضوں کی حوصلہ شکنی کے پیش نظر ہر شخص کو حصولِ دولت کے مواقع فراہم کرنے کا یقین دلاتے ہوئے دولت کو ایک جا اکٹھا ہونے سے روکتا ہے۔ یہ مقصد اسلامی قانونِ وراثت کے ذریعہ پورا کیا گیا ہے جس کی رو سے کسی متوفی شخص کی دولت کسی ایک یا خاص فرد خاندان کے قبضہ میں نہیں جا سکتی۔ بلکہ وہ جملہ قریبی رشتہ داروں میں تقسیم ہو جاتی ہے جیسے بیوی شوہر۔ بیٹے بیٹیاں۔ ماں باپ اور اگر نہ ہوں تو ہم جد قریبی رشتہ دار[۲۳]۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو یہ اختیار بھی ہے کہ وہ اپنی جائداد کو کسی نیک ارادہ کے تحت کسی شخص یا اشخاص یا کوئی ادارہ کے حق میں وقف و وصیت کر سکتا ہے[۲۴]۔

مزدوروں سے تعلقات آجر اور مزدور کے تعلقات میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس سے مزدور کا وقار قائم رہے اور اس کے مفاد کا تحفظ ہو جائے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں مزدور دو قسم کے

سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھی کہ آجر کو ہمیشہ چاہیئے کہ وہ مزدور کے ساتھ معاملات میں عدل اور احسان کو ملحوظ رکھے اور اس کی بے بسی سے کبھی ناجائز فائدہ نہ اُٹھائے۔

دو ذمہ داریاں اُن تمام تدابیر سے بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل یا دولت کے استعمال کے وقت اُن دو ذمہ داریوں کو پیشِ نظر رکھے جو قرآن نے اس پر عائد کی ہیں۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق العباد یعنی ایک تو وہ ذمہ داریاں جو اس پر اس کی اپنی ذات کی ہیں اور دوسرے معاشرہ کی ذمہ داریاں۔ قرآن نے انسانی زندگی کا جو معیار قائم کیا ہے اُسکا مظاہرہ دولت کے اسراف اور عیش و عشرت کے سامان سے نہیں ہوتا۔ اسکا مظاہرہ اس شکل میں ہوتا ہے کہ فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں۔ روحانی تقاضوں سے مراد ہے انسان کی یہ خواہش کہ وہ معاشرہ کے تقاضوں کو پورا کرے یعنی اپنی متاعِ عیش ان لوگوں کی ضروریات کیلئے بطیب خاطر دیدے جو سامانِ زیست سے محروم رہ گئے ہوں۔ اسی کو "انفاق فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک یہ تقویٰ کی زندگی ہے اور یہی زندگی خدا کی نگاہوں میں واجب التکریم ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی حکومتیں چاہتی ہیں کہ وہ مغرب کے اُن متضاد و متخاصم گروہوں میں توازن قائم رکھ سکیں جو نظام سرمایہ داری اور استراکیت نے پیدا کر رکھیں ہے تو اُن کیلئے ضروری ہوگا کہ وہ قرآن کے اقتصادی نظام

امکانات کم تھے وہاں یہ بتایا گیا کہ غلاموں کو آزاد کرانا بھی ایک روحانی ترقی کا ذریعہ ہے۔ قرآن کریم پوچھتا ہے کہ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ [26] "اور تم کو کیا خبر ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟" اور خود جواب دیتا ہے کہ فَكُّ رَقَبَةٍ "یہ ایک غلام کو آزاد کرنا ہے"۔ رسول اللہ فرماتے ہیں "کسی غلام کو آزاد کرنے سے بڑھ کر کوئی اور بات رسول اللہ کو خوش نہیں کرتی" (بخاری کتاب العتاق)

غلامی پر رسول اللہ کی ان توجہات کا اجتماعی اثر اتنا عظیم ہوا کہ غلام بھی سماج کا ایک باعزت فرد بن گیا۔ اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں کم نہیں ہیں کہ غلاموں نے بھی اسلامی مملکتوں پر حکومت کی۔ رسول اللہ کے ایک مقبول صحابی حضرت بلالؓ جن کو مسجد نبوی میں پانچ وقت بذریعہ اذاں آنحضرتؐ اور اہل ایمان کو 'صلوٰۃ' اور 'فلاح' کی دعوت دینے کا شرف حاصل تھا در اصل ایک آزاد شدہ حبشی غلام تھے۔

اسی طرح آزاد مزدوروں کا مسئلہ بھی رسول اللہ کے توجہات کا مرکز رہا۔ آپ کا ارشاد تھا کہ "مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کردو"[27] آپ نے مزدور کو "حبیب اللہ" کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ روایت ہے کہ ایک مزدور رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے ہاتھ سیاہ اور داغدار ہو گئے تھے۔ اسکی وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک معدن میں کام کرتا ہے اور اپنے آجر کیلئے پتھر خود نکالتا ہے۔ آپ نے مزدور کی طرف نظر کرم سے دیکھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔[28] اس باب میں رسول اللہ نے جس بات پر

تو اس کے لئے عالم اسلام ہی واحد ذریعہ بن سکتا ہے۔ نہ صرف واحد بلکہ ایک لائیفک ذریعہ۔ آج یورپ کے سامنے مشرق سے متعلق جو لاینحل مسائل ہیں۔ ان کا حل صرف دنیائے اسلام کے پاس ہے۔ اگر اسلام کی وساطت سے مشرق اور مغرب کہیں ایک ہو جائیں تو دنیا کے امن کے امکانات بہت وسیع ہو جائیں۔ اگر یورپ نے اسلام کے تعاون اور رابطہ سے بے اعتنائی برتی اور اس مسئلہ کو قوت کے زور پر حل کرنا چاہا تو یہ طریق کار مشرق اور مغرب دونوں کی تباہی کا موجب بن جائیگا۔

گب (Gibb) نے یہ الفاظ قریب بیس سال پہلے لکھے تھے۔ لیکن بین الاقوامی سیاست کی بساط پر ان کی اہمیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی بیس سال پہلے تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر دنیائے اسلام اور مغرب کی جمہوریتیں ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں تو ان سے دونوں کو بیحد فائدہ ہوگا۔ پروفیسر گب (Gibb) تو یہانتک کہتا ہے کہ ــــ "جہاں اپنی ثقافتی اور اقتصادی زندگی کی مکمل نشوونما کے لئے اسلام کیلئے مغرب سے تعاون لائیفک ہے، وہاں مغرب کیلئے بھی اپنی ثقافتی اور روحانی زندگی کی نشوونما کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اسلامی سوسائٹی کی مضمر قوتوں اور امکانات سے فیض یاب ہو" ــــ اب سوال یہ ہے کہ کیا مغربی جمہوریتیں اس قسم کے تعاون کیلئے راہ ہموار کریں گی؟

اس وقت اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ اندرونی خلفشار میں مبتلا ہے اس خلفشار کی وجوہات ہر ملک میں مختلف ہیں ان میں سے کچھ انکی اپنی پیدا کردہ ہیں لیکن کچھ اس رابطہ

کو اختیار کریں اور اُسے یورپ کے متخاصم گروہوں کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ اس متوسط نظریۂ حیات کو اختیار کر کے اپنی موجودہ کشمکش کو ختم کر سکیں اگر انہوں نے ایسا کر دیا تو جیسا کہ پروفیسر گب (Gibb) نے کہا ہے۔ اُن کیلئے یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ نسل اور روایات کے اُن تضادات کو مٹا کر جو دنیا کی نگاہوں میں امنڈ رہے ہیں مشرق و مغرب کی موجودہ خلیج کو پاٹ سکیں اور اس طرح انسانیت میں وحدت قائم کر سکیں۔ پروفیسر گب (Gibb) کے الفاظ یہ ہیں

اسلام کے ذمے انسانیت کی خدمت

اسلام کے ذمے انسانیت کی ایک اور خدمت بھی ہے اسلام مشرق سے بہ نسبت یورپ کے، زیادہ قریب ہے اور بین الاقوامی مصالحت اور روابط کی شاندار روایات کا حامل ہے۔ انسان کی مختلف نسلوں میں ایک ایسی وحدت پیدا کرنا جس میں مدارج اور مواقع اور سعی و عمل کی مساوات ہو ایک مشکل مسئلہ ہے لیکن اس باب میں جس قدر کامیابی اسلام کو ہوئی ہے تاریخ اُس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے افریقہ ہندوستان اور انڈونیشیا کی کثیر التعداد اسلامی آبادیاں، نیز چین کی نسبتہً قلیل اور جاپان کی بہت ہی قلیل التعداد اسلامی آبادی اس حقیقت کی زندہ دلیل ہیں کہ اسلام میں اب بھی وہ قوت موجود ہے، جس سے وہ نسل اور روایات کے اس قدر متضاد عناصر میں موافقت پیدا کر دے۔ اگر مشرق اور مغرب کی اقوام باہمی تعاون سے ایک ہو

کے باوجود ان کی معاشرتی زندگی میں ایسا استحکام پیدا ہو جائے گا جو ہر فرد و ملت کو انسانی معیار زیست عطا کر دے گا۔

زاویۂ نگاہ کی تبدیلی لیکن قرآن کے اقتصادی نظام کو از سر نو اختیار کرنے کیلئے ایک بنیادی شرط ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے اندر وہ ذہنی تبدیلی پیدا کرے جو قرآن کا مقصود ہے۔ وہ ذہنی تبدیلی جو حقوق اللہ اور حقوق العباد یعنی ذاتی ذمہ داریوں اور معاشرتی ذمہ داریوں کو یکساں اہمیت دے اور جو اس نظام زندگی کے قیام کے لئے کوشاں ہو جس میں ہر فرد دوسرے کا راعی یعنی محافظ و نگہبان بن جائے۔ یہ "ذہنیت شبانی" (یعنی وہ ذہنیت جس میں ہر فرد یہ سمجھے کہ میں انسانیت کے گلہ کا چرواہا ہوں) مسلمانوں کیلئے بھی ضروری ہے اور باقی نوع انسانی کے لئے بھی۔ جیسا کہ تاریخ اسلام سے ظاہر ہے اس ذہنیت کا فروغ جمہوری ماحول میں سب سے زیادہ ہوتا ہے لیکن قرآن کا نظریۂ جمہوریت صالحین کی جمہوریت کا نظریہ ہے یعنی اُن انسانوں کی جمہوریت جو زندگی میں پورا توازن اور قرار پیدا کرتے ہیں اور انسانی معاشرہ کو ہر قسم کے انتشار سے محفوظ رکھتے ہیں۔ کیا آج کی دنیا اس کے لئے تیار ہے کہ صفحۂ ارض پر اس قسم کی جمہوریتوں کا جال بچھ جائے جس میں ہر جمہوریت باقی جمہوریتوں کی نگہبانی کا فریضہ انجام دے؟ یہی قرآن کی دعوت ہے۔ اور یہی وہ نہج زندگی ہے جو اسکا مطلوب و مقصود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ باقی ماندہ دنیا سردست قرآن کی اس دعوت پر کان نہ دھرے اور اسے درخور اعتنا نہ

کا بھی نتیجہ ہیں جو انہوں نے مغرب سے پیدا کیا ہے۔ کیا مغربی جمہوریتیں جس حد تک بھی وہ ذمہ دار ہیں اس خلفشار کو کم کرنے کی کوشش کریں گی تاکہ مغرب اور اسلامی ممالک کے باہمی ارتباط اور خیر سگالی کی بنیادوں پر نئے رشتے استوار ہو سکیں؟ اس کے ساتھ ہی کیا یہ جمہوریتیں باہمی مفاد کی خاطر اسلامی ممالک کو وہ اقتصادی اور فنی امداد بہم پہنچائیں گی جس کی انہیں اس وقت شدید ضرورت ہے تاکہ یہ ممالک اپنے اقتصادی معیار کو بلند کر کے امنِ عالم کے قیام کے لئے ایک موثر قوت بن جائیں؟

یہ بات بہت جلد پردہ سے باہر آجائیگی کہ اسلامی ممالک کے ان تقاضوں کا جواب مغربی جمہوریتوں کی طرف سے کیا ملتا ہے۔ ان کی طرف سے کچھ بھی جواب ہو اور ان کے ردِ عمل کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو، مسلمانوں کو ایک چیز اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے اور وہ یہ کہ انہیں اس روشنی کی راہنمائی میں جو اسلام انہیں عطا کرتا ہے، اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھوں سے بنانی ہوگی۔ اگر وہ اسلام سے راہنمائی طلب کریں گے تو اسلام انہیں اس راہنمائی سے کبھی مایوس نہ کریگا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی ممالک کی موجودہ کشاکش ان کیلئے درپردہ رحمت ہے۔ یہ کشاکش اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنے خواب گراں سے بیدار ہو رہے ہیں۔ ان کی یہ باعزم بیداری یقیناً انہیں شاہراہِ حیات پر بہت آگے لے جائیگی۔ انہیں دوسری قوموں سے کچھ مدد ملے یا نہ ملے اگر انہوں نے قرآن کے اقتصادی نظام کو پوری دیانتداری سے اختیار کر لیا تو اُن کے محدود ذرائع

حوالہ جات

دیباچہ

۱۔ بیہقی، کتاب الایمان، فیض القدیر جلد سوم

۲۔ سنن ابوداؤد، کتاب الطہارۃ باب الوضو۔

۳۔ القرآن سورۃ الانبیاء، آیۃ (۱۰۵)

۴۔ القرآن سورۃ البشر آیۃ (۲۸)

۵۔ بخاری، کتاب الاحکام

۶۔ القرآن سورۃ الاعراف آیۃ (۱۷۱)

باب اول

۱۔ احیاء العلوم جلد چہارم صفحہ ۳۴۲ مطبوعہ دارالکتب العربیہ الکبریٰ مصر ۱۳۳۲ھ

۲۔ القرآن سورۃ ق آیۃ (۱۵)

۳۔ القرآن سورۃ المجادلۃ (۸)

۴۔ بخاری، کتاب الاحکام

۵۔ بیہقی، کتاب الایمان، فیض القدیر جلد سوم۔

۶۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان مطبوعہ اوسٹن فلڈ ۵۸

۷۔ القرآن سورۃ آل عمران آیۃ (۱۰۳)

۸۔ القرآن سورۃ آل عمران آیۃ (۱۰۰)

باب دوم

۱۔ رسالہ "جینوین اسلام" سنگاپور جلد اول، شمارہ ۔ ۱۹۳۶ء

۲۔ بیہقی، کتاب الایمان، فیض القدیر جلد سوم۔

۳۔ بیہقی، کتاب الایمان، فیض القدیر جلد سوم۔

۴۔ بخاری، کتاب الاحکام

باب سوم

۱۔ "ڈسکورس آن پازیٹیو ریلیجن" لندن صفحہ ۱۸۹۱ء

سمجھے لیکن اگر مسلمانوں نے بھی اس سے اعراض برتا تو اس کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر مسلمانوں کی موجودہ نسل اتنا کرلے کہ وہ اس قدامت پرستی کو چھوڑ کر جو ازمنۂ متوسطہ سے ان پر چھائی ہوئی ہے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صفاتِ خداوندی کو منعکس کرلے اور جس جمہوری اندازِ زندگی کی طرف قرآن راہنمائی کرتا ہے اسے اختیار کرے تو ان میں آج بھی اُن صلاحیتوں کی نمود ہوسکتی ہے۔ جو انہیں حوادثِ زمانہ کے زلزلوں سے محفوظ رکھ سکیں اور جن کی قوت سے یہ امنِ عالم کے قیام کا ایک موثر ذریعہ بن سکیں۔

۸ حصنِ حصین

۹ " "

۱۰ " "

۱۱ " "

۱۲ " "

۱۳ القرآن سورۃ العنکبوت آیۃ (۶۴)

باب ششم

۱ القرآن سورۃ الرحمٰن آیۃ (۲۹)

۲ مسلم، کتاب الجنۃ وصفاتہ

۳ القرآن سورۃ الرعد آیۃ (۳۵)

۴ " " محمدؐ آیۃ (۱۶)

۵ " " البقر " (۲۳)

۶ " " مریم " (۶۳)

۷ مسلم، کتاب الجنۃ وصفاتہ

۸ تفسیر کبیر، از امام فخر الدین رازیؒ جلد سوم صفحہ ۷۵ مطبوعہ استنبول ۱۳۰۸ھ

۹ مشکوٰۃ باب الحوض وصفاتہ

۱۰ "گاسپل آف زرتشت" از ڈاکٹر گرین لیس دی تھیا سوفیکل پبلشنگ ہاؤز اڈیار صفحہ ۱۲۴ تا ۱۳۸ ۱۹۵۱ء

۱۱ مسلم، کتاب الجنۃ وصفاتہ

۱۲ القرآن سورۃ مریم آیۃ (۷۲)

۱۳ "الدین" از مولانا عبدالقدیر صدیقی حیدرآباد۔

۱۴ بخاری، کتاب التوحید

۱۵ القرآن سورۃ الاعراف۔ آیۃ (۱۵۶)

۱۶ فتح البیان، فتح الباری، در منثور، احاد الارواح بحوالہ حاشیہ ترجمہ قرآن از مولانا محمد علی صفحہ ۴۷۲

۱۷ "انتخابات مثنوی" مولانا رومؒ از نکلسن صفحہ ۱۰۸

۱۸ حصنِ حصین

۱۹ فتوح الغیب از حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ

باب ہفتم

۱ تاریخ طبری صفحہ ۱۹۴۸ ۱۱ھ کے واقعات

۲ "ماوردی" الاحکام السلطانیہ باب ۱۳ صفحہ ۱۳۷ مطبوعہ قاہرہ

۲۔ ابن عبدالبر، فضل العلم

۳۔ مشکوٰۃ، کتاب العلم

۴۔ ابن حصین

۵۔ "دی رن کنزکشن آف ریلجس تھاٹ ان اسلام" صہ ۸، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۴ء

۶۔ " " " صہ ۸۶

۷۔ "لواح جامی" مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن جلد ۱۴ صفحہ ۱۷، ۱۹۰۶ء

باب چہارم

۱۔ "نیارریٹیو آف اے ایریس جرنی" از بالگریو جلد اول صہ ۳۶۷

۲۔ " " " صہ ۳۶۶

۳۔ "دی میسج آف محمدؐ" ڈینٹ اینڈ سنس لندن صہ ۴۴ ۱۹۲۳ء

۴۔ " " " "

۵۔ " " " صہ ۵۱"

۶۔ بخاری، کتاب التوحید

۷۔ حصن حصین

۸۔ مجموعہ نظم از میتھو آرنلڈ میکملین اینڈ کو لندن صہ ۱۴۲ ۱۸۹۵ء

۹۔ " " " صہ ۱۴۴

۱۰۔ بائبل، سینٹ میتھو (۳۶/۳۹)

۱۱۔ آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ از کارلائل

۱۲۔ " " " "

باب پنجم

۱۔ بخاری، باب کیف بدء الوحی

۲۔ بیہقی، کتاب الایمان، باب شعب الایمان وفیض القدیر جلد سوم صہ ۵۰۵

۳۔ حصن حصین

۴۔ " "

۵۔ " "

۶۔ دعاءِ قنوت

۷۔ حصن حصین

۱۳ بخاری، کتاب الاحکام

۱۴ القرآن سورۃ البقر آیۃ (۲۸۴)

۱۵ القرآن سورۃ محمدؐ آیۃ (۸)

۱۶ القرآن سورۃ البراءۃ آیۃ (۶۰)

۱۷ القرآن سورۃ یوسفؑ آیۃ (۱)

۱۸ القرآن سورۃ البقر آیۃ (۲۶۷) و سورۃ الحشر آیۃ (۷) سورۃ الانعام آیۃ (۱۴)

۱۹ القرآن سورۃ البقر آیۃ (۱۹۱) سورۃ البقر آیۃ (۱۷۲) سورۃ الدہر آیۃ (۸)

۲۰ بخاری، کتاب الزکوٰۃ۔ و تاریخ طبری ص ۱۸۴۸ واقعات ۱۱ھ

۲۱ "پان اسلام ازم اینڈ بالشویزم" از مشیر حسین قدوائی ص ۳۱۱

۲۲ القرآن سورۃ البقر آیۃ (۲۷۵)

۲۳ القرآن سورۃ الحشر آیۃ (۶۰)

۲۴ القرآن سورۃ النساء آیۃ (۱۱، ۱۲ اور ۱۷۶)

۲۵ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "تفسیر طبری" جلد ۴ سورۃ النساء آیۃ (۱۱، ۱۲) نیز بخاری، کتاب الوصیت اور ہدایہ جلد ۴ کتاب الوصایا۔

۲۶ القرآن سورۃ البلد آیۃ (۱۲، ۱۳)

۲۷ خطبہ حجۃ الوداع

۲۸ "پان اسلام ازم اینڈ بالشویزم" ص ۲۷۱

۲۹ "ابن ماجہ" باب الرجل یسقی

۳۰ اسلام کے معاشی نظام کی تفصیل کیلئے ڈاکٹر محمد یوسف الدین ریڈر شعبۂ مذہب و ثقافت جامعۂ عثمانیہ کی کتاب "اسلام کے معاشی نظریے" ملاحظہ ہو جو دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اس کا انگریزی ایڈیشن "دی اکنامکس ڈاکٹرنز آف اسلام" زیر طبع ہے نیز عربی ترجمہ بھی

۳۱ "ورید اسلام" از پروفیسر ایچ۔ اے۔ آر گب ص ۲۷۶

۳۲ " " " " ص ۲۷۸

۳۔ بخاری، کتاب الدیۃ

۴۔ بخاری، کتاب الجہاد، کتاب المناقب، فضائل حضرت عثمانؓ

۵۔ "دی پریچنگ آف اسلام" از سر تھامس آرنلڈ صـ۵۱

۶۔ " " " "

۷۔ " " صـ۴۹، ۵۰

باب ہشتم

۱۔

۲۔ اخبار "اسٹیمین" دہلی مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۵۲ء صـ۱

۳۔ "کرنٹ ٹرینڈس اِن اسلام" پر پروفیسر فلپ حتی کا خطبہ صدارت مجموعہ موسومہ "اسلام اِن دی ماڈرن ورلڈ" شائع کردہ دی مڈلسٹ انسٹیٹیوٹ، واشنگٹن صـ۸۷

۴۔ مضمون "اسلام اِن ماڈرن ٹرکی" از جان کنگسلے برج جو "اسلام اِن دی ماڈرن ورلڈ" کے صـ۴۳، ۴۴ پر درج ہے۔

۵۔ " " " " صـ۴۴

۶۔ " " " " صـ۴۵

۷۔ " " " " صـ۴۶

۸۔ "سیورین کاسن کا مضمون رسالہ "کوریر" جلد ۴ عـ۱۲ ماہ دسمبر ۱۹۵۱ء صـ۲

۹۔ اخبار "ہندو" مدارس مورخہ ۲ اپریل ۱۹۵۲ء صـ۲

۱۰۔ "دی ہیتج آف فیٹ" از ونسٹن چرچل صـ۵

۱۱۔ "لائف اِن ریڈ چائنا" از الین وینگٹن مضمون شائع شدہ اخبار "سٹے اسٹینڈرڈ" بمبئی ۶۷ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۴۹ء

۱۲۔ "وید اور اسلام" صـ۳۷۹ از پروفیسر ایچ اے آر گب مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء

ب

بحراوقیانوس صـ۱۵۲

بحرالکاہل صـ۱۵۲

بخاریؒ (امام) صـ۱۴

بخاری (صحیح بخاری) صـ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۹۲

برج (جون کنگسلے) صـ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۳

برجس (جی، ایچ) صـ۴۲

برک (اڈمنڈ برک) صـ۱۸۳

بلالؓ (حضرت) صـ۱۹۲

بنی اسرائیل صـ۱۳۶

بیت المقدس صـ۱۴۳

پ

پال گریو صـ۶۳

پل صراط صـ۱۰۸

ت

"تبلیغ اسلام" (کتاب) صـ۱۴۳

ترکی صـ۱۵۳، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۳

تفسیر کبیر (کتاب) صـ۱۰۷

ٹ

ٹرومن (پریزیڈنٹ) صـ۱۶۰

"ٹنٹرن آبی" (نظم) صـ۵۹

ج

جاپان صـ۱۹۴

جارج میک گھی صـ۱۵۸

جامعہ انقرہ صـ۱۷۱، ۱۷۳

جامعہ عثمانیہ صـ۷

جبریہ (مسئلہ جبریہ) صـ۶۲، ۶۳

جنرل اسمبلی صـ۱۵۴، ۱۵۵

جہاد صـ۵۴، ۸۵، ۱۸۹

چ

چرچل صـ۱۸۰، ۱۸۲

چین صـ۴۳، ۱۸۴، ۱۹۴

ح

حتّی (پروفیسر) صـ۱۶۵

د

دائرۃ المعارف صـ۱۱۹

اِشاریہ

الف

ابن خلکان صہ ۱۴

ابن قیم صہ ۱۲۰

ابن مسکویہ صہ ۱۲۵

ابوبکرؓ (حضرت) صہ ۱۴۰، ۱۴۴

اتاترک صہ ۱۶۸

اجتہاد صہ ۱۳۷، ۱۴۶، ۱۶۹

احاد الارواح (کتاب) صہ ۱۲۰

احیاء العلوم (کتاب) صہ ۹

ادارۂ مشرق وسطیٰ صہ ۱۶۳

آرنلڈ تھامس صہ ۱۴۳، ۱۴۴

آرنلڈ میتھو صہ ۳۳

استنبول صہ ۱۷۰

اسٹالن صہ ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳

اشتراکیت صہ ۱۶۴، ۱۹۳

افریقہ صہ ۱۶۵، ۱۷۲، ۱۷۵، ۱۹۴

اقبال (سر محمد اقبال) صہ ۵۲، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۸

امپی ڈاکلس ان ٹینا صہ ۸۰، ۸۵

امریکہ (ممالک متحدہ امریکہ) صہ ۲، ۱۵۲، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۷، ۱۸۱

"انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ" صہ ۱۱، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۶۵، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۸

انڈونیشیاء صہ ۱۹۴

انگلستان (برطانیہ) صہ ۳۴، ۱۶۶

ایچی سن (ڈین) صہ ۱۶۰، ۱۶۱

ایرانی صہ ۱۴۹

ایشیاء صہ ۱۵۲

ایکرمن صہ ۵۲

اینگلو امریکن صہ ۱۵۲، ۱۷۷

ایلین وننگٹن صہ ۱۸۴

اینڈروز (سی۔ایف آنجہانی) صہ ۲۲

ف

فتح الباری (کتاب) صـ۱۲۰

فتح البیان (کتاب) صـ۱۲۰

فرانس صـ۳۴، ۱۶۶

فقہ صـ۱۴۶، ۱۴۸، ۱۷۳

فلسطین صـ۱۶۶

فوز الکبیر (کتاب) صـ۱۲۵

فیثا غورث صـ۴۳

ق

قدریہ (مسلۂ قدریہ) صـ۶۲

قرونِ وسطیٰ صـ۶، ۷، ۹، ۱۷، ۴۳، ۶۴، ۱۴۷، ۱۵۰

ک

کانٹ صـ۴۲

کارلائل صـ۸۸، ۹۴

کتب خانہ آصفیہ صـ۷

کلارک صـ۶۴

کمیونزم صـ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۹، ۱۷۴، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷

کنزل العمال (کتاب) صـ۱۱۹

کنفیوشیس صـ۴۳

کنگ لیر صـ۳

کوریا صـ۱۷۵

کیتھل ازم صـ۱۸۶

گ

گب (پروفیسر) صـ۱۸۶، ۱۹۴

گوئٹھے صـ۵۲، ۸۸

گیتھ سمنی صـ۸۶

ل

لاطینی صـ۴۲

لیپزگ صـ۷

م

مدینہ صـ۹، ۱۲

مسلمؒ (امام) صـ۱۱۸، ۱۱۹

مسیحؑ (حضرت) صـ۱

مشرقِ وسطیٰ صـ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۷۵

مکہ صـ۹

دُرِمنثور (کتاب) صـ۱۴۰

ذ

ذمی صـ۱۴۲، ۱۴۳

ر

رازی، (فخرالدین رازی) صـ۱۰۷

روس (سوویٹ روس) صـ۲، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۷۴، ۱۷۸، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷

رومی (مولانا جلال الدین رومی) صـ۵۵، ۱۰۸، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۸

ز

زرتشت (زرتشتی) صـ۶۵، ۱۰۸

س

سانفرانسکو (مقام) صـ۱۵۴

سینٹ جان صـ۳۳

ش

شیکسپیر صـ۳

شوریٰ صـ۱۳۷، ۱۳۸

ع

عباسی صـ۱۳، ۱۷، ۶۲

عثمانؓ (حضرت) صـ۱۴۱

عبدالقادر جیلانی (سیدنا حضرت شیخ اعظم) صـ۱۳۳

عبدالقدیر صدیقی (علامہ) صـ۶

عبداللطیف (سید، ڈاکٹر) صـ۸

عجمی صـ۴۳

عرب صـ۱۲، ۱۳۸، ۱۷۲

عمرؓ (حضرت) صـ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۸، ۱۲۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴

علیؓ (حضرت) صـ۱۴۱، ۱۴۲

عیسائی صـ۲۷، ۴۳، ۵۳، ۵۹، ۶۹، ۱۱۵

عیسیٰؑ (حضرت) صـ۸۶

غ

غزالیؒ (امام) صـ۹، ۵۶، ۵۹

منشور اقوام متحدہ صـ۱۱، ۱۷۴
میاسنو (پروفیسر) صـ۱۸۶
میتھوآرنلڈ صـ۳۳
میسوکیاسان صـ۱۷۵

ن

نسطوری صـ۱۴۹
نصاریٰ صـ۲۷، ۴۲
نوفلاطونی صـ۱۴۹
نہرو (جواہرلال) صـ۱۶۱
نیشنل ازم صـ۱۸۶

و

واڈیا (اردشیر سہراب جی۔ پروفیسر) صـ۶۵
واشنگٹن صـ۱۶۳
ولیم میور (سر) صـ۶۳، ۶۴

ھ

ہرقل صـ۱۰۷
ہندوستان صـ۲۳، ۱۶۱، ۱۹۴

ی

یوسف الدین (ڈاکٹر) صـ۸
یونان صـ۱۲، ۲۴، ۵۲، ۶۹، ۱۳۸
یہود صـ۲۷، ۴۲، ۱۱۵، ۱۴۲، ۱۴۹